Quarterly Journal of the Qur'an Academy

The Qur'anic Horizons

Patron: Dr. Israr Ahmad

April-June '96 issue is under print!

Contents

- The Spirit of Revolution (Editorial)
- The Objective and Goal of Muhammad's Prophethood (SAAWS) - II (By Dr. Israr Ahmad)
- The Qur'an and *Riba* (By Dr. Sayyid Tahir)
- Islamic Revolutionary Thought and its Decline (By Dr. Israr Ahmad)
- In Search of Knowledge (By Farhan Shamsi)

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an Lahore

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حکمتِ قرآن

لاھور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی
معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)
ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۵ | محرم الحرام ۱۴۱۷ھ جون ۱۹۹۶ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱
کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شادی گھری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے
مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

احباب جانتے ہیں کہ "حقیقت ایمان" جیسا اہم موضوع محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دل پسند موضوعات میں سے ایک ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر وہ بارہا مجمل اور مفصل' ہر دو انداز میں تقاریر فرما چکے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے خطاب میں بھی انہوں نے موضوع کا احاطہ کیا ہے اور ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے گیارہ خطابات کی صورت میں بھی موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس موضوع پر تاحال کوئی تحریری مواد موجود نہیں تھا' نہ کتابی شکل میں اور نہ "میثاق" یا "حکمت قرآن" میں مضمون کی صورت میں۔ اس کمی کا احساس ہمیں ایک عرصے سے تھا لیکن بوجوہ کوئی صورت بن نہیں آ رہی تھی۔ اب بحمد اللہ ہمارے ایک محترم ساتھی مولانا شبیر بن نور نے جو گزشتہ کئی برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہیں' اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ موصوف نے "حقیقت ایمان" کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے ان خطابات کو مرتب کرنے کے کام کا آغاز کر دیا ہے جو نہایت جامع بھی ہیں اور مبسوط بھی۔ ۱۹۹۱ء کے "محاضرات قرآنی" میں مسلسل پانچ روز حقیقت ایمان کے موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے خطابات ہوئے تھے' جن میں موصوف نے اس موضوع پر اپنی اب تک کی سوچ کا حاصل مرتب انداز میں پیش فرمایا تھا۔ انہی خطابات کو تحریری طور پر مرتب کرنے کا کام بحمد اللہ اب شروع ہوا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ کام بحسن و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ "حکمت قرآن" میں ان خطابات کی اشاعت کی تکمیل پر ان شاء اللہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ اس سلسلے کی پہلی قسط زیر نظر شمارے میں قارئین کی نظر سے گزرے گی۔

"قومی ملکیت زمین اور اسلام" کے عنوان سے چوہدری صادق علی مرحوم کے ایک اہم مقالے کی پہلی قسط گزشتہ شمارے میں شائع کی گئی تھی۔ اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے کو ایک الگ کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا ہے جس کا عنوان ہے "مسئلہ ملکیت زمین اور اسلام"۔ کل ۴۴ صفحات پر مشتمل یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے جس کی فی نسخہ قیمت صرف پانچ روپے ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتابچے کو بڑے پیمانے پر پھیلایا جائے اور زمین کی ملکیت اور بالخصوص پاکستان کی اراضی کی نوعیت جیسے اہم مسئلے سے متعلق دین کی تعلیمات اور شرعی احکام کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ ○○

حقیقتِ ایمان

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا فکر انگیز سلسلۂ تقاریر

بموقع محاضراتِ قرآنی' ۱۹۹۱ء

مرتب : مولانا ابو عبد الرحمٰن شبیر بن نور

(۱)

چند تمہیدی امور

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا' من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له' واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله

—— اما بعد :

﴿ فاى الفريقين احق بالامن ان كنتم تعلمون ○ الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم اولئك لهم الامن وهم مهتدون ○﴾ {۱}

وقال تبارك وتعالى كما ورد فى اول سورة البقرة :

﴿ الم ○ ذلك الكتاب لاريب فيه' هدى للمتقين ○

{۱} سورۃ الانعام آیت نمبر ۸۱ ـ ۸۲ (ترجمہ : "دونوں فریقوں میں سے کون امن اور بے خوفی و اطمینان کا زیادہ مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو ـ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا ـ")

الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوہ ومماھم رزقناھم ینفقون O والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک' وبالاخرہ ھم یوقنون O اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون O﴾{۲}

وقال جل وعلا کماورد فی وسط السورہ :

﴿لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخرو الملئکہ و الکتاب والنبیین.....﴾{۳}

وقال تبارک وتعالی کماورد فی آخر السورہ :

﴿آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون' کل آمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ' لانفرق احدا من رسلہ' وقالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر﴾{۴}

{۲} سورۃ البقرہ آیت نمبر۱-۵ (ترجمہ : "الف' لام' میم- یہ "الکتاب" ہے' اس میں کوئی شک نہیں' ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں- اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں- ایسے لوگ ہی اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں")-

{۳} سورۃ البقرہ آیت نمبر۱۷۷ (ترجمہ : "نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور یوم آخر اور فرشتوں کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے"-)

{۴} سورۃ البقرہ آیت نمبر۲۸۵ (ترجمہ : "رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے- یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے

وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول عند رویہ الھلال :

((اللھم اھلہ علینا بالامن والایمان والسلامہ والاسلام' ربی وربک اللہ)){۵}

مذکورہ بالا آیات قرآنی اور مسنون دعا کی تلاوت کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا : آج سے ہم اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اس سال کے پانچ روزہ محاضرات قرآنی کا آغاز کر رہے ہیں جن کا مرکزی عنوان ہے :"حقیقت ایمان"۔

آج یہاں حاضر ہونے سے پہلے جب میں تمہیدی کلمات کے بارے میں سوچ رہا تھا تو سابقہ بیس پچیس سال پر محیط تاریخ کا نقشہ ایک فلم کی طرح پردۂ ذہن پر گھوم گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عرصے میں دین کی خدمت کا جو بھی موقع میرے لئے میسر فرمایا اور جس ذہنی' فکری اور دعوتی تگ ودو کی توفیق میرے نصیب میں لکھی' خواہ یہ خدمت مرکزی انجمن خدام القرآن کے سٹیج سے ہوئی یا تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے' اس ساری محنت کے چار بنیادی موضوعات (Main themes) رہے ہیں :

۱ ۔ فرائض دینی کا جامع تصور

۲ ۔ اسلام کا نظام عدل اجتماعی اور اس کے نمایاں خدوخال

سے الگ نہیں کرتے' ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی' مالک ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے"۔)

{۵} سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب ما یقول عند رویہ الھلال' حدیث ۳۴۵۱۔ المستدرک للحاکم ۴/۲۸۵۔ مسند احمد ۱/۱۶۲۔ سنن الدارمی ۲/۴۔ علامہ العصر جناب محمد ناصر الدین الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے ملاحظہ ہو سلسلہ الاحادیث الصحیحہ ۴/۴۳۰' حدیث نمبر ۱۸۱۶۔

(ترجمہ : "اے اللہ! اس ہلال کو امن و ایمان اور سلامتی اسلام کا موجب بنا کر ہمارے لئے طلوع فرما (اور اے چاند) میرا اور تمہارا رب اللہ ہے"۔)

۳ ۔ منہج انقلاب اسلامی

۴ ۔ حقیقت ایمان

۱۔ فرائض دینی کا جامع تصور :

ان میں سے اولین 'اہم ترین اور ہر لحاظ سے بنیادی اور اساسی موضوع (Theme) "فرائض دینی کا جامع تصور" ہے۔ اس حوالے سے میں دیکھتا ہوں کہ آج کل اخبارات میں ہمارا کچھ مذاق بھی اڑایا جا رہا ہے' تاہم میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ ہماری پہچان بن گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کی بدولت میں نے اپنی توانائیوں کا بیشتر حصہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب سے ماخوذ "فرائض دینی کے جامع تصور" کی وضاحت پر ہی صرف کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اسی جامع تصور کو ہی بنیاد بنا کر قرآن حکیم سے یہ منتخب نصاب مرتب کیا گیا ہے جس کے دروس کو ہماری اس تحریک کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے ——— مسخ شدہ طبیعتوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے' عام طور پر انسان کی فکر اور اس کے کردار کے مابین ایک لازمی تعلق ہوا کرتا ہے' چنانچہ نارمل حالات میں انسان کا عمل اس کی فکر اور سوچ کے تابع ہوتا ہے۔ اب اگر "فرائض" کے بارے میں ہمارا تصور صحیح ہو جائے یعنی اسلام کی آفاقی تعلیمات کے مطابق جامع اور ہمہ گیر ہو جائے تو یقیناً ہمارا عمل بھی درست' جامع اور ہمہ گیر ہو جائے گا۔ میں نے سب سے زیادہ محنت قرآن حکیم کے اسی منتخب نصاب کے بیان پر صرف کی ہے۔ بار بار ان مقامات کے درس دیئے ہیں' فرائض دینی کے اس جامع تصور کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے چالیس چالیس روزہ قرآنی کیمپ منعقد کئے ہیں' اس کے علاوہ سات سات اور دس دس دن کی تربیت گاہیں بھی منعقد کی ہیں۔ اپنے ملک پاکستان سے نکل کر ٹورنٹو اور شکاگو میں جا کر بھی یہ ذمہ داری ادا کی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جہاں جہاں میں جا سکا اس فکر کو پہنچایا ہے' بلکہ دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں یہ فکر آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔

تصور فرائض دینی کے سلسلے میں سب سے زیادہ تاکیدی عنصر "فریضہ اقامت دین"

کا ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے ہم بحیثیت امت فراموش کر چکے ہیں اور اسی کو سب سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تصور دراصل ایک دینی تحریک کا ورثہ ہے جس کے ساتھ میری گہری وابستگی رہی ہے۔ اسی تحریک نے مجھے یہ تصور دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دینی تحریک خود موجودہ بے دین ملحد جمہوری سیاست کی دلدل میں پھنس چکی ہے اور نتیجتاً "فریضہ اقامت دین" کے اس بنیادی تصور ہی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ فریضہ اقامت دین پر یقین رکھنے والے جو لوگ اس تحریک سے علیحدہ ہوئے انہوں نے کچھ وقت تو اس کوشش میں صرف کیا کہ پھر اس تصور کے تحت کوئی اجتماعی جدوجہد شروع کریں' لیکن جب پے در پے ناکامیاں ہوئیں تو بالآخر ان میں سے بعض نے یہ سمجھتے ہوئے کہ انگور کھٹے ہیں' یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کام فرائض دین میں شامل ہی نہیں ہے' نتیجتاً اس امت کی ایک بڑی قیمتی متاع ضائع ہو گئی۔

اس صدی میں دین کا یہ تصور نہایت وضاحت کے ساتھ اور نکھر کر سامنے آیا کہ دین ایک مکمل نظام زندگی ہے اور یہ کہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ یہ تصور اس امت کی بہت قیمتی متاع ہے۔ بعض اسباب کی بنا پر کچھ عرصے سے یہ تصور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا' کچھ حضرات کی مساعی اور گراں قدر خدمات کے نتیجے میں دوبارہ اجاگر ہوا۔ لیکن اب میں پھر دیکھ رہا ہوں کہ وہ گم ہو رہا ہے' ابہام اور شکوک و شبہات کا شکار ہو رہا ہے' لہٰذا میں نے اپنا اولین فریضہ یہی سمجھا کہ اس کو پھر سے اجاگر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے میں نے اپنا یہ فرض ادا کیا ہے اور اس توفیق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اسی تصور فرائض دینی کے تحت اب ایک اجتماعیت وجود میں آچکی ہے۔

یہی نہیں' بلکہ ۱۹۸۵ء میں میں نے علماء کرام کو دعوت دے کر چھ دن متواتر اس موضوع پر ان کے خیالات سننے کا اہتمام کیا۔ ہوا یوں کہ میں نے قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطالعے سے جو کچھ سمجھا اسے تحریری شکل میں پیشگی طور پر اہل علم کی خدمت میں پیش کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ فرائض دینی کا یہ خاکہ میرے سامنے ہے' اگر اس میں کوئی غلطی یا خامی ہے تو محاضرات قرآنی میں تشریف لا کر میرے رفقاء و احباب کے سامنے مجھے اس غلطی پر متنبہ فرمائیں۔ میری اس دعوت پر ہر طبقہ فکر سے تعلق

رکھنے والے پچیس علماء تشریف لائے جن میں دیوبندی بھی تھے۔ بریلوی بھی اور اہلحدیث بھی اور جماعت اسلامی کے بعض اکابر بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے طنز و استہزاء کا معاملہ بھی کیا تاہم تمام مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء نے میرے فکر کی بحیثیت مجموعی تائید کی۔ اس کے علاوہ پچیس حضرات نے علمی تحریروں سے بھی نوازا۔ مجھے اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ کہیں کہیں لفظی اصلاح بھی بعض علماء نے تجویز کی جس کا میں نے خیر مقدم کیا۔ اور میں ہمیشہ اس کے لئے ذہناً تیار رہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو واضح ہونے پر علی الاعلان اس کا اعتراف کروں اور اپنی اصلاح کرلوں۔ بہرکیف میں نے ۱۹۹۱ء کے سالانہ اجتماع میں "فرائض دینی کے جامع تصور" کے موضوع پر اپنے خیالات کو مرتب کرکے تین گھنٹے کے مفصل خطاب کی صورت میں ریکارڈ کرادیا ہے۔ اور اس طرح گویا آج کی تاریخ تک فرائض دینی کے بارے میں میرا جو بھی حاصل مطالعہ ہے اسے نہایت جامعیت کے ساتھ میں اپنی اس تقریر کے ذریعے سے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرچکا ہوں۔

۲۔ اسلام کا نظام عدل اجتماعی اور اس کے نمایاں خدوخال

دوسرا اہم موضوع یا Theme جس کی تفصیلی وضاحت میں اپنے دروس و تقاریر کے ذریعے کرتا رہا ہوں' اس کا تعلق اسلام کے نظام عدل اجتماعی سے ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جو زندگی کے تمام گوشوں میں ہمیں رہنمائی دیتا ہے اور پورے نظام زندگی پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ چنانچہ اقامت دین کا مطلب ہے پوری انسانی زندگی پر دین کا غلبہ ——— انفرادی سطح پر بھی ——— اور ——— اجتماعی سطح پر بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف گوشوں یعنی سماجی و معاشرتی' معاشی و اقتصادی اور سیاسی و دستوری میدان میں اسلام کا وہ نظام عدل اجتماعی ہے کیا؟ اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اس کے مابہ الامتیاز پہلو کون کون سے ہیں؟ ان تمام مسائل میں بہت سا ابہام موجود ہے' کیونکہ عرصہ دراز سے اسلام کا نظام عدل اجتماعی اپنی اصل صورت میں دنیا میں کہیں قائم نہیں رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حسین و جمیل چہرے پر داغ دھبے پڑ چکے ہیں۔ بیگانے تو کیا خود اپنے بھی اسے پہچان نہیں رہے۔ اس لئے کہ خلافت راشدہ کے بعد

عرصہ دراز تک اس پر ملوکیت کی چھاپ پڑی رہی۔ اس طرح اسلام کا اصل چہرہ تاریخ کے پردوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد سرمایہ داری اور جاگیرداری کی سیاہ رات اس پر چھا گئی۔ یوں پوری انسانی زندگی کو شامل دین رفتہ رفتہ محض ایک مذہب بن کر رہ گیا' اس نے ایک مکمل نظام زندگی کی شکل میں دور خلافت راشدہ کے بعد آج تک پھر کبھی دنیا کو اپنی شکل نہیں دکھائی۔ آج روئے زمین پر مسلمانوں کی متعدد حکومتیں اور بادشاہتیں ضرور موجود ہیں لیکن زمین پر کوئی ایک انچ زمین جگہ نہیں جہاں اسلام کا نظام عدل اجتماعی اپنی اصل شکل میں موجود ہو' حالانکہ صحیح اور سچا نظام یہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطور دین پسند کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔

تاہم دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ نوع انسانی قافلہ اس دوران فکری طور پر کہیں ٹھہرا نہیں گیا بلکہ مسلسل چودہ صدیوں سے اپنے انداز میں ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے ساتھ ساتھ عمرانی ارتقاء کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ ذرا غور کریں' سیاسی میدان میں نوع انسانی نے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے بادشاہت کے نظام کا خاتمہ کیا جس کی جڑیں نہایت گہری تھیں' اس کے بعد جمہوریت کا تجربہ کیا۔ اسی طرح اقتصادی میدان میں سرمایہ داری کے خلاف شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا اور دوسری انتہا تک پہنچ کر کمیونزم کا تجربہ کیا' پھر ان دو انتہاؤں کے مابین Synthesis یا تالیف کا معاملہ ہوا جس کے نتیجے میں سکنڈے نیوین سوشلزم کا نظریہ سامنے آیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ جمہوریت' یہ سوشلزم اور یہ سکنڈے نیوین سوشلزم' آیا یہ کل کے کل کفر ہیں یا ان میں خیر کا کوئی پہلو بھی موجود ہے؟ "فرائض دینی کے جامع تصور" کی طرح یہ موضوع بھی میرے نزدیک نہایت اہم ہے۔ اس لئے کہ دین کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے ضمن میں جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمارے اندر جذبہ ہو' ایثار ہو' قربانی ہو' تاکہ ہم محنت کریں' جدوجہد کریں اور تن' من' دھن سب کچھ لگا دینے کے لئے تیار ہوں' اتنی ہی اہمیت اس بات کی ہے کہ دین کے بارے میں ہمارا تصور واضح ہو اور معلوم ہو کہ یہ نظام کیا ہے؟ سیاسی سطح پر اس کے خدوخال کیا ہیں؟ معاشی سطح پر اس کے خدوخال کیا ہیں؟ وغیرہ

میں نے اس سے قبل بارہا اعلان و اعتراف کیا ہے' آج پھر یہی بات دہراؤں گا کہ اس

ضمن میں مجھے سب سے زیادہ راہنمائی فکر اقبال سے ملی ہے۔ دور حاضر کی ذہنی اور فکری سطح کے اعتبار سے علامہ اقبال سے زیادہ کسی نے قرآن حکیم کو سمجھا۔ اس اعتبار سے ان کا مقام بہت عظیم ہے۔ ان کے مشاہدے' مطالعے اور تجزیئے کا حاصل اشعار میں بڑی عمدگی سے سمویا گیا ہے :

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ ؐ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است

کہ نوع انسانی نے عمرانی ارتقاء کا جو طویل سفر طے کیا ہے اس سے اگر کوئی روشنی' کوئی خیر' کوئی بھلائی تمہیں نظر آتی ہے تو یہ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار ہے اور اگر کوئی کمی ہے تو اس کی تلافی کے لئے نوع انسانی چار و ناچار اسی نظام مصطفیٰ کی طرف کشاں کشاں کھنچی چلی جا رہی ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ٹھوکریں کھائے گی' افراط و تفریط کے دھکے کھائے گی لیکن بالآخر یہ قافلہ انسانیت وہیں پہنچ کر رہے گا۔

ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا جمہوریت یا سوشلزم کل کے کل کفر ہیں یا ان میں کسی پہلو سے اسلام کے ساتھ کوئی مطابقت موجود ہے؟ اور اگر ہے تو کتنی ہے کہ جسے ہم اپنا سکتے ہوں! معروف قول ہے "الحکمۃ ضالۃ المؤمن ھو احق بھا حیث وجدھا" {۶} یعنی "حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے' جہاں سے بھی ملے وہ اس کا سب سے پہلے حقدار ہے"۔ ہم ان چیزوں کو پورے کا پورا رد کر دیں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے' اس میں کسی اور کا نقصان نہیں ہے۔ البتہ جس جس پہلو سے اس میں کمی ہے اس کا واضح شعور ہونا چاہئے {۷} اور اس کا کھلے بندوں اظہار و اعتراف بھی ہونا چاہئے۔

گزشتہ تین سال سے ہمارے ہاں محاضرات قرآنی کا Main theme یہی موضوع یعنی "اسلام کا نظام عدل اجتماعی" یا "اسلام کا نظام حیات" رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں اس عنوان

کے تحت پہلے لاہور میں اور پھر کراچی میں ہم نے محاضرات منعقد کئے۔ اگلے سال پھر اسی موضوع کو ہم نے محاضرات قرآنی کا عنوان بنایا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ "اسلام کا نظام عدل اجتماعی" یا "اسلام کا نظام حیات" وہ دوسرا اہم موضوع (Main theme) ہے جو اب تک میری ساری ذہنی و فکری جدوجہد کا محور رہا ہے اور بحمد اللہ اب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو قوت بیان عطا فرمائی ہے اس کے استعمال کا دوسرا بڑا اور بنیادی نکتہ یہی عنوان رہا ہے۔

۳۔ منہج انقلاب اسلامی

تیسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہ انقلاب برپا کیسے ہو؟ اس کا طریق کار (Method) کیا ہے؟ اس کے مراحل کون کون سے ہیں؟

منہج انقلاب اسلامی کو جاننے کا ہمارے پاس بنیادی طور پر ایک ہی ذریعہ (Source) ہے' اور وہ ہے اسوۂ محمدیؐ۔ چنانچہ اس پہلو سے سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے کہ معلوم کیا جائے کہ انقلاب نبوی کا طریق کار کیا تھا؟ آپ ﷺ نے کن خطوط پر چل کر انقلاب برپا کیا؟ آپ کی جدوجہد کے مراحل کیا تھے؟ سیرت نبوی کی روشنی میں ہمارے لئے یہ معین کرنا آسان ہو گا کہ ہر ہر مرحلے کے اہم نکات کیا ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ پھر یہ کہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک بڑھنے میں کیا چیز شرط کا درجہ رکھتی ہے' کہ وہ شرط اگر پوری ہو تب آگے بڑھا جا سکتا ہے' اور اگر وہ شرط پوری نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اگلا قدم اٹھانا بے کار ہو گا اور محنت و صلاحیت ضائع جائے گی۔ اس ضمن میں' میں خاص طور پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کا ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے سیرت کانفرنسوں کا جو سلسلہ شروع کیا اور ان میں چونکہ تقاریر کے لئے بالعموم مجھے مدعو کیا جاتا تھا' تو یہ موقعہ میرے لئے سیرت النبی ﷺ کے از سر نو بالاستیعاب مطالعے کے لئے ایک بڑا محرک اور بہت سے اعتبارات سے نہایت مفید ثابت ہوا۔ جب مجھے پے در پے عوام و خواص کے اجتماعات میں سیرت کے موضوع پر تقاریر کرنا پڑیں تو مجھے غور و فکر کے لئے ایک تحریک ملی اور مطالعہ سیرت کا ایک تازہ جذبہ بیدار ہوا' اس طرح سیرت نبویؐ کے مطالعے

سے مجھ پر واضح ہوا کہ صحیح معنوں میں "منہج انقلاب اسلامی" کیا ہے۔ اسی موضوع پر پھر میں نے گیارہ تقریریں مسجد دارالسلام میں کیں اور موضوع کے تمام گوشوں کو بالکل واضح کر دیا وُالحمدللہ علی نعمتہٖ۔ میری یہ تقریریں کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ان تقاریر کو باقاعدہ ایک تصنیف کی شکل میں پیش کروں' اللہ کرے یہ مرحلہ جلد طے ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

بہرحال "منہج انقلاب اسلامی" کے موضوع پر میرا جو بھی حاصل مطالعہ ہے اسے بھی اس سال (یعنی اپریل ۱۹۹۱ء میں) میں نے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں گیارہ تقاریر کی بجائے تین گھنٹے کی ایک تقریر میں سمو دیا ہے تاکہ عام لوگوں کو بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

۴۔ حقیقت ایمان

اس سلسلے کا چوتھا بنیادی نکتہ جو میرے غور و فکر کا مرکز و محور اور دورس و تقاریر کا موضوع رہا وہ "حقیقت ایمان" ہے۔ اور انگریزی محاورہ "Last but not the least" کے مطابق اگرچہ ترتیب میں یہ آخری ہے لیکن کسی بھی اعتبار سے کمتر نہیں ہے' بس بیان میں چوتھے نمبر پر آگیا ہے۔ اس کی اہمیت تو مجھ پر اول روز سے واضح ہے۔ جب میں نے اپنے طور پر دعوتی و تحریکی جدوجہد کا آغاز کیا تو "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا' جو جون ۱۹۶۷ء کے میثاق میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں "قرآن اکیڈمی" کا تصور موجود تھا۔ اس وقت تعلیم و تعلّم قرآن کو تحریک کی شکل میں برپا کرنے کا خاکہ ذہن میں آیا تھا۔ ۱۹۶۷ء سے آج ۱۹۹۱ء تک چوبیس برس بیت گئے ہیں' اور اللہ کا شکر ہے کہ اس پر عمل جاری ہے۔ بہرحال اس کتابچے کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ اگرچہ اس صدی کا یہ خاص معاملہ ہے کہ اس میں عالمی سطح پر احیائے اسلام کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے' گزشتہ پچاس ساٹھ برس سے جماعت اسلامی' الاخوان المسلمون' مسجومی پارٹی' تبلیغی جماعت' عبادالرحمٰن گروپ اور سعید نورسی کی تحریک' سب ہی اپنے اپنے انداز میں اور اپنی فکر کے مطابق پوری محنت کے ساتھ کوشش کر رہے ہیں' لیکن یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ یہ سب تحریکیں دنیوی نتائج کے اعتبار

سے ناکام کیوں نظر آتی ہیں؟ تاحال کہیں بھی اسلامی انقلاب بالفعل برپا نہیں ہو سکا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میری رائے میں ان تمام تحریکوں کے خلوص اور محنت کے باوجود ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تحریکیں ایمان کو Taken for granted لے رہی ہیں' یعنی جب ہم مسلمان ہیں تو ایمان تو لازماً موجود ہے۔ جو زور ایمان کے حصول پر ہونا چاہئے تھا اس کی ان تحریکوں نے بالعموم ضرورت نہیں محسوس کی۔ حالانکہ یہی وہ چیز ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔ جسے ہم ایمان سمجھ رہے ہیں وہ محض ایک موروثی عقیدہ ہے جس کا ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں' لیکن حقیقی ایمان یعنی یقین قلبی اور Conviction کے درجے تک پہنچنے والا ایمان سرے سے مفقود ہے۔ ہم اپنی زندگیوں کو دیکھیں' اپنے معمولات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں' اپنی اقدار کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر ہمارے ذہن و قلب پر مسلط ہے۔ آخرت پر اگر فی الواقع ایمان موجود ہو تو انسان کی دنیاوی زندگی کچھ اور ہی قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اگر ذہن و قلب میں راسخ ہو تو کچھ اور ہی طرح کا کردار وجود میں آتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے حقیقی محبت اگر دل میں موجود ہو تو اس کا اظہار کسی اور طرح سے ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل کمی یہاں ہے' پانی یہاں مر رہا ہے!!

ان تحریکوں کی ناکامی میں کچھ حصہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا بھی ہے کہ ایک متعدبہ افراد اور معاشرے کے ذہین عناصر کے ذہنوں کو بدلے بغیر قبل از وقت سیاسی میدان میں چھلانگ لگا دی گئی۔ مختلف تحریکوں نے اس نوع کی غلطیاں بھی کی ہیں' لیکن ان تمام غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایمان پر جو زور (Emphasis) ہونا چاہئے تھا' وہ نہیں ہے۔ ۱۹۶۷ء سے میری یہی رائے ہے اور میں ہمیشہ اپنی رائے کسی لومۃ لائم کی پروا کئے بغیر بیان کر دیا کرتا ہوں۔ میری ذہنی و فکری تگ و دو اور دعوتی و تحریکی جدوجہد کے اعتبار سے چوتھا موضوع یا Theme یہی "حقیقت ایمان" ہے' مگر اہمیت کے اعتبار سے یہ پہلے نمبر پر ہے۔ بسط و اختصار کے ساتھ میں نے حقیقتِ ایمان پر متعدد بار گفتگو کی ہے' لیکن ۱۹۸۷ء میں مسجد دارالسلام میں گیارہ خطبات جمعہ میں اس کا احاطہ کیا اور اس ضمن میں جو

اعتراضات' تجاویز اور اصلاحات سامنے آئیں ان پر غور و فکر کیا اور دلیل واضح ہونے پر بعض اصلاحات کو قبول بھی کیا۔ چنانچہ اس وقت میری یہ کوشش ہے کہ اپنی سوچ کو پانچ خطبات میں سمو کر پیش کر دوں۔ (جاری ہے)

مدیر "ندائے خلافت" اقتدار احمد مرحوم کی پہلی باقاعدہ تصنیف
ترکی کے ایک سفر کی تاثراتی روداد
جس میں وہ امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ہمرکاب تھے

زبانِ یارِ من ترکی ...

اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے ایک منفرد سفرنامہ
جو قاری کو جا بجا دعوتِ فکر بھی دیتا ہے اور اسلام کی عظمتِ پارینہ کے حوالے سے خون کے آنسو بھی رلاتا ہے۔
جس میں دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کی صحیح صحیح منظر نگاری بھی ہے' اور زبان و ادب کی چاشنی بھی!
جس میں حقائق کی نہایت عمدہ لفظی تصویر کشی ہی پر اکتفا نہیں کی گئی' ترکی کے قابلِ دید مقامات کی دیدہ زیب رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں
جسے بجا طور پر حسنِ معنوی اور حسنِ ظاہری کا دلآویز مرقع قرار دیا جا سکتا ہے

عمدہ کمپیوٹر کتابت' نفیس طباعت' دبیز سفید کاغذ' خوشنما سرورق' مضبوط دیدہ زیب جلد
صفحات ۲۰۰' قیمت -/۱۲۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

توضیح وتنقیح

ایک اہم اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل

مولانا محمد طاسین صاحب کے نام ایک خط اور مولانا کی جانب سے اس کا جواب

۶ فروری ۱۹۹۶ء

مکرمی جناب مولانا محمد طاسین صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ "حکمت قرآن" کی وساطت سے ایک مسئلہ کی الجھن دور کرنا چاہتا ہوں' قرآن وسنت کی روشنی میں تشفی فرمائیں۔ مسئلہ کا تعلق اسلام کے معاشی نظام کے حوالہ سے ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص نے کسی کو کچھ رقم بطور قرض دی اور کچھ عرصہ بعد ادائیگی کو کہا۔ لیکن اس مدت کے دوران کرنسی کی قیمت گر جاتی ہے (جیسا کہ اب ہوا ہے) تو اس صورت میں قرض کی ادائیگی کی صورت کیا ہوگی؟ اصل رقم واجب الادا ہوگی یا اس کمی کو بھی پورا کیا جائے گا؟ اگر صرف اصل رقم کی واپسی ہوگی تو اس صورت میں قرض دینے والے کا نقصان ہے' ایک تو اس نے نیکی کی' دوسرا اسے نقصان (روپے کی کمی) ہو' حالانکہ اسلام کا یہ اصول ہے کہ "لاضرر ولاضرار" یعنی تم نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ اور نہ کسی سے نقصان برداشت کرو۔

اس سوال کا تفصیلی جواب مطلوب ہے ——— شکریہ

احقر العباد

قاری محمد عمر

دار الحافظ۔ ایم ڈی اے روڈ ملتان

جواب از مولانا محمد طاسین صاحب

مجلس علمی فاؤنڈیشن

۱۲/اپریل ۹۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر محترم جناب قاری محمد عمر صاحب زادک اللہ علما!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ! اللہ کرے مزاج گرامی بخیر ہوں!

موقر ماہنامہ "حکمت قرآن" کے توسط سے آپ کا خط ملا جس میں آپ نے ایک اہم مسئلہ کے متعلق استفسار فرمایا ہے جو آج کل عام طور پر علمی حلقوں میں موضوع بحث و تحقیق بنا ہوا ہے۔ پھر چونکہ اس مسئلے کا تعلق حقوق العباد اور حلال و حرام سے ہے لہٰذا ضروری ہے کہ علماء کرام اس کا اسلامی حل پیش فرمائیں!

میرے علم و فہم اور غور و فکر کے مطابق اس مسئلے کا جو حل اور اس سوال کا جو جواب ہے اس کو پیش کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ دو اصولی باتیں عرض کر دوں جن سے میرے حل اور جواب کا گہرا تعلق ہے۔

پہلی بات یہ کہ عہد حاضر میں قرض کے طور پر دیئے لئے جانے والے مال دو قسم کے ہیں' ایک حقیقی مال اور دوسرے اعتباری اور حکمی مال---- حقیقی مال کی تعریف میں وہ سب اشیاء آتی ہیں جن کی ذات میں انسان کی کسی طبعی و جبلی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو' جیسے کھانے پینے' پہننے پوشنے' رہنے سہنے وغیرہ سے متعلق اشیاء جن کی بازاروں میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان میں راحت و آسائش اور تعیش و تنعم کی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اور اعتباری و حکمی مال سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کی ذات کے اندر مذکورہ صلاحیت نہ پائی جاتی ہو' لیکن معاشرے نے بعض اغراض و مقاصد کی خاطر ان کو حقیقی اموال کے تبادلے اور لین دین کا ذریعہ اور معیار تسلیم اور اعتبار کر لیا ہو' جیسے کرنسی نوٹ کہ جو کاغذ کی حیثیت سے اپنے اندر مالیت نہیں رکھتے' لیکن معاشرے اور اس کی نمائندہ حکومت نے ان کو سہولت کی خاطر سونے چاندی کی طرح زر اعتبار کر لیا اور قانوناً

ان کو ثمن یعنی ایسی چیز کی حیثیت دے دی ہے جس کے ذریعے حقیقی اموال کی خرید و فروخت کی جاسکتی ہے' چنانچہ جب کوئی حکومت اپنے کرنسی نوٹوں کی منسوخی کا اعلان کر دیتی ہے تو ان کی مذکورہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اب ہزار روپے کے منسوخ شدہ نوٹ سے ایک پنسل تک نہیں مل سکتی۔ مذکورہ دو قسم کے مال چونکہ اپنی حقیقت و ماہیت اور اپنی غرض و مقصدیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہیں لہٰذا قرض کے لین دین میں دونوں کا شرعی حکم ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہے جو آگے بیان کیا جائے گا۔

دوسری اصولی بات یہ کہ شریعت اسلامی میں قرض کی جو تعریف اور معنوی حقیقت ہے اس کی رو سے لازم قرار پاتا ہے کہ مقروض بوقت ادائیگی قدر و قیمت کے لحاظ سے اس مال کی مثل قرض خواہ کو ادا کرے جو اس نے بطور قرض لیا تھا' یعنی ادا کیا جانے والا مال قدر و قیمت میں اس مال کے مساوی اور برابر ہو جو اس نے کسی سے قرض کے طور پر لیا تھا' اس سے نہ کم ہو اور نہ لازماً زیادہ ہو' چنانچہ شریعت اسلامی کی رو سے ایسی چیزوں کو قرض پر لینا دینا ممنوع ہے جن کی قدر و قیمت کے لحاظ سے مثل ممکن نہ ہو سکتی ہو' بعض احادیث نبویہ میں جانور قرض لینے دینے کی جو ممانعت ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ دو جانور کبھی بھی ہر وصف اور ہر لحاظ سے سو فیصد برابر اور مساوی نہیں ہو سکتے بلکہ کسی نہ کسی پہلو سے ان کے اندر اختلاف ضرور موجود رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ قرض پر لئے ہوئے جانور کے بدلے میں بوقت ادائیگی دوسرا جو بھی جانور دیا جائے وہ لئے ہوئے جانور سے کمی و بیشی کے لحاظ سے ضرور کچھ نہ کچھ مختلف ہو گا' اس کے مثل اور برابر نہ ہو گا' جبکہ شرعاً لازمی ہے کہ مقروض ادائیگی کے وقت لئے ہوئے مال کی مثل ادا کرے جو قدر و قیمت میں اس کے برابر ہو۔

اسی طرح کرنسی نوٹ جو دراصل حقیقی مال نہیں' اعتباری اور حکمی مال ہیں' معاشرے کے ان کو سونے چاندی وغیرہ کے سکوں کی طرح مال اعتبار کر لینے سے بلاشبہ ان کے اندر قوت خرید پیدا ہو جاتی ہے' لیکن کرنسی نوٹوں کی یہ اعتباری قوت خرید ایک حال پر قائم نہیں رہتی بلکہ خاص طرح کے حالات کے زیر اثر بدلتی اور عموماً کم اور کبھی زیادہ ہو جایا کرتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مثلاً دس سال پہلے ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ کی جو قوت خرید تھی وہ آج آدھی بھی نہیں' دس سال پہلے ایک ہزار کے کرنسی نوٹوں سے جتنی

اشیائے ضرورت ملتی تھیں آج ان کی نصف اور آدھی بھی نہیں مل سکتیں' حالانکہ نوٹوں کی بناوٹ اور شکل صورت جو دس برس پہلے تھی وہی اب بھی ہے' لیکن قوت خرید کے لحاظ سے ان کے مابین نمایاں فرق ہے جو افراط زر اور انفلیشن (Inflation) کی وجہ سے ضرور واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ کرنسی نوٹوں کے قرض کا معاملہ جبکہ وہ طویل المیعاد ہو اور اس میں یہ طے ہو کہ قرض کے طور پر جتنے نوٹ لئے دیئے گئے ہیں بوقت ادائیگی اتنے ہی نوٹ دیئے لئے جائیں گے شرعاً ناجائز معاملہ قرار پاتا ہے کیونکہ اس میں قرض دینے والے کو اس کے مال کی مثل نہیں ملتی جس کا وہ حقدار ہوتا ہے۔ کرنسی نوٹوں میں مثل کا مطلب ہے قوت خرید میں برابری جو مذکورہ صورت میں نہیں ہو سکتی کیونکہ آج کے کرنسی نوٹ قوت خرید میں ان نوٹوں کی قوت خرید کے برابر نہیں ہو سکتے جو مثلاً پانچ سال پہلے قرض کے طور پر دیئے لئے گئے تھے' لہٰذا اگر کرنسی نوٹوں کے قرض میں یہ ضروری ٹھہرایا جائے کہ جتنی تعداد میں وہ قرض لئے گئے ہوں ٹھیک اتنی ہی تعداد میں بوقت ادائیگی وہ واپس کئے جائیں تو اس صورت میں قرض دینے والے فریق کو نقصان پہنچتا اور اس کی لازماً حق تلفی ہوتی ہے' چنانچہ اس وجہ سے بھی معاملہ مذکور ظلم و حق تلفی کی بنا پر باطل اور ناجائز قرار پاتا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیش نظر کرنسی نوٹوں کے قرض کی اسلامی شریعت کے مطابق جائز شکل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ انکے قرض میں کسی حقیقی مال کا اعتبار کیا اور اس کو معیار بنایا جائے اور ادائیگی اس کے مطابق ہو' یعنی یہ دیکھا جائے کہ جس وقت جو کرنسی نوٹ قرض لئے دیئے گئے اس وقت ان کے عوض بازار میں کتنی مقدار میں سونا مل سکتا تھا' پھر ادائیگی جب بھی ہو سونے کی اس مقدار کے برابر ہو' یعنی ادائیگی کے وقت سونے کی اس مقدار کی قیمت اگر قرض پر دیئے ہوئے نوٹوں کے برابر ہو تو مقروض اتنے ہی نوٹ ادا کرے جتنے اس نے لئے تھے۔ اور اگر سونے کی اس مقدار کی قیمت بڑھ جائے مثلاً ایک ہزار کی بجائے اب اس کی قیمت گیارہ سو روپے ہو گئی ہو تو مقروض پر لازم ہو گا کہ وہ ایک ہزار کی بجائے گیارہ سو کے نوٹ ادا کرے تاکہ قرض خواہ کو اس کا حق پورا پورا ملے اور معاملہ عدل کے مطابق طے پائے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ ایک ہزار کے نوٹ قرض دے کر کچھ عرصہ کے بعد مقروض سے گیارہ سو کے نوٹ وصول کرنا' بظاہر ربا کا معاملہ لگتا ہے جو جائز نہ ہونا چاہئے' تو اس کا جواب یہ کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ مال کی دو قسمیں ہیں' ایک مال حقیقی اور دوسرا مال اعتباری و حکمی' اور یہ کہ قرض کے معاملہ میں مال کی ان دو قسموں کا شرعی حکم الگ الگ ہے۔ مال حقیقی کے قرض میں شرعی حکم یہ ہے کہ جس مقدار میں وہ کسی کو بطور قرض دیا جائے بوقت وصولی ٹھیک اسی مقدار میں وصول کیا جائے' اپنا حق سمجھ کر اس سے کچھ بھی زائد لینا بلاشبہ ربا ہے جو قطعی حرام ہے' لیکن کرنسی نوٹوں کی شکل میں اعتباری مال ہو تو اس کے قرض میں شرعی حکم یہ نہیں کہ وہ جس مقدار اور تعداد میں قرض دیا گیا ہو بوقت ادائیگی ٹھیک اسی مقدار اور تعداد میں ادا کیا جائے کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر بعض حالات میں جب افراط زر کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہو جائے' جیسے کہ ہمارے ہاں پاکستان میں کچھ عرصہ سے مسلسل ہو رہی ہے' یہ معاملہ عدل کے خلاف ہو جاتا ہے' اس لئے کہ اس صورت میں قرض دینے والے کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا نہیں ملتا اور اس کو لازماً ضرر و نقصان پہنچتا ہے۔ کرنسی نوٹوں کے قرض میں عدل کی واحد صورت یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت قرض دینے والے کو مقروض اتنے سونے کے حساب سے نوٹ ادا کرے جتنا سونا ان نوٹوں کے بدلے میں بازار میں مل سکتا تھا جو اس نے قرض میں لئے تھے اس میں مقروض کی کسی طرح کی کوئی حق تلفی نہیں ہوتی اور قرض خواہ کو اس کا پورا پورا حق مل جاتا ہے جیسا کہ عدل کا تقاضا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی مفید اور مناسب سمجھتا ہوں کہ بعض دفعہ کسی ملک کے مخصوص معاشی حالات کی وجہ سے اس کی کاغذی کرنسی یعنی نوٹوں کی قوت خرید میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس کی تہہ میں مختلف قسم کے بہت سے اسباب و عوامل کار فرما ہوتے ہیں یہ اسباب و عوامل جن کے نتیجہ میں افراط زر اور انفلیشن کی کیفیت پیدا ہوتی اور کاغذی کرنسی کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے داخلی اور ملکی بھی ہوتے ہیں اور خارجی و بین المملکتی بھی' لہٰذا اس کے اچھے برے اثرات سے معاشرے کے تقریباً سب افراد ضرور متاثر ہوتے ہیں' کوئی بھی ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈال سکتا کیونکہ اس میں سب کی

حیثیت مساویانہ ہوتی ہے۔ افراط زر اور انفلیشن سے کاغذی کرنسی یعنی نوٹوں کی حد تک تو لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے لیکن دوسری تمام چیزوں میں فائدہ پہنچتا ہے' لوگوں کی ملکیت میں جتنی اشیاء ہوتی ہیں خواہ وہ تجارتی ساز و سامان کی شکل میں ہوں یا غیر منقولہ جائیداد وغیرہ کی شکل میں' ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں جیسے رہائشی مکان' فرنیچر اور گاڑی وغیرہ یا مشینوں وغیرہ کی شکل میں صنعتی سرمایہ ہو' ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگ ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں پتی بن جاتے ہیں' مزدوروں اور ملازموں کی اجرتوں اور تنخواہوں میں بھی نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہرحال کوئی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا جو اوپر پیش کی گئی ہے۔

افراط زر کے حوالے سے جو باتیں پڑھنے سننے میں آئی ہیں ان میں سے ایک نہایت غلط اور گمراہ کن بات یہ ہے کہ چونکہ اس سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں کمی واقع ہوتی ہے لہٰذا کرنسی نوٹوں کی شکل میں بینک کو دیئے گئے سودی قرضہ پر بینک سے سود لینا جائز ہے۔ گویا یہ بات کہنے والے کے نزدیک اس کمی کا ذمہ دار بینک ہے اور یہ کہ اگر وہ نوٹ بینک کو دینے کی بجائے کھاتہ دار کے پاس ہوتے تو ان میں کمی واقع نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے' کیونکہ وہ کمی تو ہر صورت میں واقع ہو کے رہتی ہے' کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔

والسلام

محمد طاسین عفی عنہ

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۹۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت؛ قیمت فی نسخہ -/۱۲ روپے

سُورۃ البقرۃ

آیات ۸۴ _ ۸۶

ملاحظہ : کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبرا کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۵:۲ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ
هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ
بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى

تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ
يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ
الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

۲:۵۲:۱ اللغۃ

مربوط مضمون ہونے کی بنا پر ہم نے اس قطعہ میں تین آیات کو شامل کیا ہے اور ایک آیت کی طوالت کے باعث یہ (زیر مطالعہ) قطعہ آیات بھی ذرا طویل ہو گیا ہے۔ تاہم اس قطعہ کے قریباً پچاس سے زائد کلمات میں سے بیشتر پہلے ہی زیر بحث آ چکے ہیں' بلکہ نئے (پہلی دفعہ آنے والے) مادے اس میں کل آٹھ ہی ہیں۔ بہرحال کلمات کی لغوی تشریح کی تفصیل یوں ہے:

[وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ] قریباً یہی عبارت گزشتہ قطعہ آیات [۲:۵۱:۱] میں گزر چکی ہے' صرف یہ فرق ہے کہ یہاں 'میثاق' کے بعد مضاف الیہ ضمیر 'کُمْ' ہے جب کہ گزشتہ قطعہ (۲:۵۱) میں اس کا مضاف الیہ 'بنی اسرائیل' تھا۔ اس عبارت کے تمام کلمات کی الگ الگ لغوی تشریح کے گزشتہ حوالے بھی اسی [۲:۵۱:۱] میں دیئے جا چکے ہیں۔

● عبارت کا لفظی ترجمہ ہے 'اور جب ہم نے لیا عہد تمہارا' یعنی 'جب ہم نے تم سے میثاق/عہد/قول و قرار/پکا قول لیا' مخاطب اس میں بھی بنی اسرائیل ہی ہیں۔

[لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ] یہ بھی ایک جملہ بنتا ہے جس کے پہلے حصے 'لَا تَسْفِكُوْنَ' کا مادہ س ف ک اور وزن (لا نافیہ یعنی 'نہیں' نکال کر) 'تَفْعِلُوْنَ' بنتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد 'سَفَكَ... يَسْفِكُ

(بہانا۔ گرانا (خون) کے باب اور معنی واستعمال پر البقرۃ: ۳۰ [۲: ۲۱: ۱ (۵)] میں بات ہو چکی ہے۔ گویا "لَا تَسْفِكُوْنَ" اس فعل مجرد سے فعل مضارع منفی "بِلا" کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس کا ترجمہ ہے "تم نہیں بہاؤ گے"۔ کیا نہیں بہاؤ گے؟ یہ آگے بیان ہوا ہے: "دِمَاءَكُمْ" کی آخری ضمیر مجرور "كُمْ" بمعنی "تمہارا/ تمہارے/ تمہاری" ہے اور لفظ "دِمَاءٌ" کا مادہ "دم ی" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ اصلی شکل "دِمَایٌ" تھی جس میں الف ممدودہ کے بعد آنے والی "ی" کو "ء" میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ "دَمٌ" (بمعنی خون/ لہو) کی جمع مکسر ہے۔ اس لفظ کی مکمل لغوی تشریح بھی البقرہ: ۳۰ [۲: ۲۱: ۱ (۶)] میں گزر چکی ہے۔ یہاں "دِمَاءَكُمْ" کا ترجمہ ہے "تمہارے خون"۔

● اس طرح اس پورے جملہ (لا تسفکون دماءکم) کا لفظی ترجمہ بنا "تم نہیں بہاؤ گے تمہارے (یعنی "اپنے") خون/ لہو"۔ پھر "اپنے خون" کا بامحاورہ ترجمہ "اپنوں کا خون/ اپنے خون/ آپس میں خون" سے کیا گیا ہے اور چونکہ خون کے لیے جمع کا صیغہ "دِمَاءَ" آیا ہے (یعنی "خونوں" کو نہیں بہاؤ گے)، اس مفہوم کو بامحاورہ ترجمہ میں "باہمی خون ریزی" اور "آپس میں کشت وخون" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہاں بھی (قطعہ ۲: ۵۱ کے "لا تعبدون" کی طرح) صیغہ مضارع منفی "میثاق" اور "قول وقرار" کی شرائط کے بیان میں آیا ہے اس لیے اس میں دراصل فعل نہی کا مفہوم ہے۔ اس لیے "لا تسفکون" کا ترجمہ "اَن لا تسفکوا" کی طرح "کہ تم مت بہاؤ" کی صورت میں کیا گیا ہے جس کی بامحاورہ صورتیں "(خون) نہ کرنا، (خون) نہ بہانا" (خونریزی) مت کرنا" اختیار کی گئی ہیں جن میں نہی کے ساتھ تاکید کا مفہوم بھی ہے۔ اگرچہ بعض نے لفظی ترجمہ فعل مضارع ہی کے ساتھ "نہ کرو گے خون سے بھی کیا ہے۔

۲: ۵۲: ۱ (۱) [وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ] اس عبارت میں ابتدائی "وَلَا" واوِ عاطفہ اور "لَا" نافیہ ہے: "لَا" کی تکرار (ایک پہلے "لا تسفکون" میں آیا ہے) کے باعث یہاں "وَلَا" کا ترجمہ "اور نہ ہی" ہوگا۔

"تُخْرِجُوْنَ" کا مادہ "خ ر ج" اور وزن "تُفْعِلُوْنَ" ہے یعنی یہ اس مادہ سے بابِ افعال کا فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (خَرَجَ یَخْرُجُ = نکلنا) پر البقرۃ: ۴۷ [۲: ۴۶: ۱ (۵)] میں اور بابِ افعال (اخرج یُخْرِجُ اِخراجًا = نکالنا) کے معنی وغیرہ پر البقرۃ: ۲۲ [۲: ۱۶: ۱ (۱۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

"اَنْفُسَكُمْ" کے ابتدائی حصہ "اَنْفُس" (جو "نَفْسٌ" کی جمع مکسر ہے) کے مادہ وغیرہ کی بات البقرۃ ۹ [۲: ۸: ۱ (۴)] میں "انفسھم" کے ضمن میں ہو چکی ہے۔ "انفسکم" کا ترجمہ ہے "تمہاری/ اپنی

جانوں کو۔"

"مِنْ دِیَارِکُمْ" کے شروع میں "مِنْ" (بمعنی "میں سے") ہے اور آخر پر ضمیر مجرور "کُمْ" (بمعنی تمہارا/ تمہارے) ہے۔ اور باقی لفظ "دِیَارٌ" (جو یہاں مجرور اور خفیف آیا ہے جس کی وجہ آگے "الاعراب" میں دیکھئے) کا مادہ "د و ر" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ یہ دراصل "دِوَار" تھا۔ پھر واو متحرکہ ماقبل مکسور "یاء" میں بدل کر لکھی بولی جاتی ہے (جیسے "رِضْوَن" سے "رَضِیَ" ہو جاتا ہے) اور لفظ "دیار" ہو جاتا ہے۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "دارَ یدُورُ دَوْرًا" (نصر سے) کے بنیادی معنی ہیں: "گھومنا۔ گھوم جانا"۔ عموماً یہ بطور فعل لازم ہی استعمال ہوتا ہے اور "بِ" یا "علی" کے صلات کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے اور کبھی بطور فعل متعدی "گھمانا اور لپیٹنا" کے معنی بھی دیتا ہے مثلاً "دار العِمامةَ حولَ رأسِہ" (اس نے اپنے سر کے گرد پگڑی لپیٹی)۔ تاہم قرآن کریم میں یہ فعل مجرد صرف بطور فعل لازم اور بغیر کسی صلہ وغیرہ کے صرف اپنے ابتدائی معنی (گھومنا) میں صرف ایک جگہ (الاحزاب: ۱۹) استعمال ہوا ہے۔ اور اس سے مزید فیہ کے باب افعال سے بھی ایک ہی صیغۂ فعل (البقرہ: ۲۸۲) آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مادہ سے مشتق اور ماخوذ کلمات (مثلاً دار، دیار، دیّار، دائرۃ اور دوائر) متعدد جگہ آتے ہیں جن پر حسب موقع بات ہوگی ان شاء اللہ۔

● زیر مطالعہ لفظ "دیار" (جو معرفہ نکرہ مفرد مرکب صورتوں میں قرآن کریم کے اندر ۱۶ جگہ آیا ہے) کا واحد "دارٌ" بمعنی "گھر" ہے (اور یہ لفظ بھی دراصل "دَوَرٌ" تھا پھر واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لکھی اور بولی جاتی ہے اور لفظ "دار" ہو جاتا ہے) گویا دراصل "دور" کی ہی جمع "دِوار" تھی جو "دیار" بنی، جیسے "ثوب" (کپڑا) کی جمع "ثِواب" کی بجائے "ثِیابٌ" آتی ہے۔ "دِیار" کا مطلب ہے "گھروں"۔

● یوں اس زیر مطالعہ عبارت (ولا تخرجون انفسکم من دیارکم) کا لفظی ترجمہ بنے گا: "اور نہ ہی تم نکالو گے اپنی جانوں/ اپنے شخصوں کو تمہارے (اپنے) گھروں میں سے"۔ پھر گزشتہ قطعہ کے "دماءکم" کی طرح یہاں بھی "انفسکم" کا بامحاورہ ترجمہ "اپنوں کو"، "اپنے لوگوں کو" یا "ایک دوسرے کو" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اور "من دیارکم" (اپنے گھروں میں سے) کا بامحاورہ ترجمہ "اپنے وطن سے"، "اپنی بستیوں سے" اور "انفسکم" کے ترجمہ "اپنوں کو" کی مناسبت سے اردو محاورے میں "دیارکم" کا ترجمہ "ان کے گھروں سے / وطن سے" کے ساتھ بھی کر دیا گیا ہے یعنی ضمیر مخاطب کی بجائے ضمیر غائب کے ساتھ۔ اسے محاورے کی مجبوری کہہ لیجئے۔ اسی طرح "لا تخرجون" کا ترجمہ نہی مؤکد کے ساتھ "نہ نکالنا، مت نکالنا" کی صورت میں کیا گیا ہے جس کی وجہ اوپر "لا تعبدون" اور "لا تسفکون" کے ضمن میں بیان ہوئی

ہے بعض نے "لاتخرجون" کا ترجمہ "نہ جلاوطن کرنا" سے کیا ہے جو اردو محاورے میں مستعمل ہے۔

۲:۵۲:۱(۲) [ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ] "ثُمَّ" (پھر/اس کے بعد) کئی دفعہ گزر چکا ہے "اَقْرَرْتُمْ" کا مادہ ق ر ر اور وزن "اَفْعَلْتُمْ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (قرَّ یقِرُّ = ٹھنڈا ہونا۔ ٹھیرنا وغیرہ) پر البقرہ: ۳۶ —— [۲:۲۶:۱(۲۰)] میں کلمہ "مُستقر" (ٹھکانا) کے ضمن میں بات ہوئی تھی۔ زیر مطالعہ لفظ "اقررتم" اس مادہ سے باب افعال کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ باب افعال کے اس فعل "اَقرَّ ...... یُقِرُّ (اَقْرَرَ یُقْرِرُ) اقرارًا" کے متعدد معنی ہیں مثلاً "ٹھنڈ میں داخل ہونا، ٹِک جانا، مان لینا، پکا کرنا، نافذ کرنا" وغیرہ۔ اور "بِ" یا "لِ" (کے صلہ) کے ساتھ "اعتراف کرنا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس سے "اقرار کرنا" بھی مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل سے صرف چار صیغے (تین ماضی اور ایک مضارع) آئے ہیں۔ ماضی کے تینوں صیغوں میں یہ "اقرار کرنا" ہی کے لیے آیا ہے، البتہ مضارع کا صیغہ "پکا کرنا، ٹھیرائے رکھنا" کے معنی میں آیا ہے۔ زیر مطالعہ عبارت میں قریباً سب نے اس کا ترجمہ "پھر تم نے اقرار کیا/اقرار کر لیا" سے ہی کیا ہے، ایک آدھ نے "قول منظور کر لیا" سے کیا ہے۔ مفہوم یکساں ہے۔

[وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ] اس میں "وَ" (اور) اور "انتم" (تم) کے بعد جو صیغہ فعل "تَشْهَدُوْنَ" آیا ہے جس کا مادہ "ش ہ د" اور وزن "تَفْعَلُوْنَ" ہے، اس کے فعل مجرد (شہِد یشہَد = گواہ ہونا۔ مان لینا) کے باب وغیرہ پر البقرہ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۸)] میں بحث ہو چکی ہے۔ اس طرح یہاں اس عبارت (وانتم تشھدون) کا ترجمہ بنتا ہے "اور تم گواہی دیتے ہو"۔ جسے "تم شاہد ہو/شہادت دیتے ہو/گواہ ہو" کی صورت بھی دی گئی ہے اور بعض نے "اقرار کرتے ہو/مانتے ہوئے" سے بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ بعض نے یہاں مخاطب کے صیغے کے باوجود ساتھ "انتم" لانے کی بنا پر ترجمہ یوں کیا ہے "اور (اس بات یعنی تمہارے بڑوں کے اقرار اور قبول میثاق کے) گواہ تو تم خود بھی ہو۔ یعنی گواہی دیتے ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔"

[ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاۗءِ] "ثُمَّ" (پھر) اور "انتم" (تم) کی طرح "ھٰؤلاء" پر بھی پہلے بات ہو چکی ہے دیکھئے البقرہ: ۳۱ [۲:۲۲:۱] میں۔ "ھٰؤلاء" جو اسم اشارہ قریب برائے جمع (مذکر و مؤنث) استعمال ہوتا ہے البقرہ: ۲ [۲:۱:۱(۱)] میں "ذٰلِكَ" کے ضمن میں اس کی ساخت اور بناوٹ پر بھی بات ہوئی تھی۔ "ھٰؤلاء" کا ترجمہ تو ہے "یہ سب (لوگ)"۔ اور یوں اس فقرے (ثم انتم ھٰؤلاء) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پھر تم ہو یہ (لوگ)"۔ جسے اردو محاورے کے مطابق "پھر تم وہ لوگ ہو/پھر تم وہی ہو/تم ہی وہ ہو/وہی تم ہو" کی صورت دی گئی ہے۔ اس پر مزید بات "الاعراب" میں ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ] "تقتلون" جو "ق ت ل" مادہ سے باب نصر کے فعل مجرد (قتل یقتُل = مار ڈالنا۔ قتل کرنا) کا فعل مضارع صیغہ جمع مذکر حاضر ہے' اس فعل کے معنی وغیرہ کی مزید وضاحت کے لیے دیکھ لیجئے البقرہ ۵۴ [۲:۳۴:۱ (۴)]۔ "انفسکم" ابھی اوپر گزرا ہے (لا تخرجون انفسکم" میں) لفظی ترجمہ اس جملے کا بنتا ہے "تم قتل کرتے ہو اپنی جانوں کو" جس کی بامحاورہ صورت ہے "مار ڈالتے ہو/ خون کرتے ہو/ قتل کرتے ہو/ کر دیتے ہو" یہاں بھی "انفسکم" کا بامحاورہ ترجمہ "اپنوں کو/ آپس میں/ اپنوں کا" بنتا ہے۔ اور چونکہ یہاں ان لوگوں کی کئی خرابیوں اور بُرے کاموں کا یکے بعد دیگرے ذکر ہے (جیسا کہ آگے آرہا ہے) اس لیے اردو محاورے کی خاطر بعض نے یہاں فعل کے ساتھ "بھی" کا استعمال کیا ہے یعنی "اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو" اور چونکہ یہاں ان کے میثاق توڑ کر ماضی میں بھی اس کی خلاف ورزی کا ذکر ہے اس لیے بعض نے اسے تاریخی واقعات کے بیان کے طور پر بصیغہ ماضی ہی ترجمہ کر دیا ہے یعنی "تم اپنوں کو قتل کرنے لگے" کی صورت میں؛ جسے بلحاظ مفہوم ہی درست کہہ سکتے ہیں۔

[وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ] اس پورے جملے کے تمام کلمات پہلے گزر چکے ہیں مثلاً "تُخْرِجُوْنَ" ابھی اوپر بصیغہ منفی "لا تخرجون انفسکم" میں گزرا ہے۔ "فریقًا" کے مادہ' وزن (ف ر ق سے فَعِیْل) کے فعل مجرد اور لفظ "فریق" (گروہ) کے معنی وغیرہ پر البقرہ:۷۵ [۲:۴۷:۱ (۲)] میں بات ہو چکی ہے اور "مِنْ دِيَارِهِمْ" سے ملتی جلتی ترکیب "من دیارکم" ابھی گزری ہے جس میں لفظ "دیار" کی لغوی وضاحت کی جا چکی ہے۔ دیکھئے اوپر [۲:۵۲:۱ (۲)]۔

● یوں اس زیر مطالعہ عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے: "اور تم نکال دیتے ہو ایک گروہ کو اپنے میں سے گھروں ان کے سے"۔ پھر بامحاورہ کرنے کے لیے "فریقًا منکم" کا ترجمہ "اپنے ایک فرقہ کو/ اپنے میں سے ایک گروہ کو/ اپنے ہی ایک گروہ کو" کی صورت میں کیا گیا۔ "تُخْرِجُوْنَ" کا ترجمہ "نکال دیتے ہو" کے علاوہ "ترکِ وطن کراتے ہو" اور "دیس نکالا کرتے ہو" سے بھی کیا گیا۔ مفہوم وہی ہے۔ اسی طرح "من دیارھم" (ان کے گھروں میں سے) کا ترجمہ "ان کے وطن سے" سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہاں بھی ان کی نبرد آزار برائیوں کے ذکر کی بنا پر اردو محاورے میں فعل کے ساتھ "بھی" کا استعمال موزوں ہے یعنی "نکال بھی دیتے ہو" کی صورت میں۔

۲:۵۲:۱ (۳) [تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ] (یہاں املاء کا فرق اور فعل کی ساخت سمجھانے کے لیے "تظاھرون" رسم املائی کے مطابق لکھا گیا ہے' اس کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی)

"تَظٰهَرُوْنَ" کا مادہ "ظ ھ ر" اور وزن (موجودہ) "تَفَاعَلُوْنَ" ہے۔ اصلی وزن "تَتَفَاعَلُوْنَ" اور

اصلی شکل "تتظاھَرُون" ہے۔ پھر صیغۂ مضارع میں دو "تاء" جمع ہونے کی صورت میں (جو باب تفعل اور تفاعل کے صیغوں میں ہوتا ہے) ایک "تاء" کو کتابت اور تلفظ سے گرا دینا جائز ہوتا ہے (ضروری نہیں ہوتا)۔ تاہم قرآن کریم میں جہاں جو لفظ جس طرح آیا ہے اسی طرح پڑھا جاتا ہے۔

● اس مادہ (ظھر) سے فعل مجرد "ظھَر یظھَر ظُھُورًا" (فتح سے) آتا ہے اور کے بنیادی معنی ہیں: "ظاہر ہو جانا، نمودار ہونا۔ چھپی ہوئی چیز کا سامنے آجانا"۔ اس کے مقابلے کا لفظ "بَطَنَ" (چھپا ہونا۔ پوشیدہ ہونا) ہے جیسے "لاتقربوا الفوا حش ما ظھرَ منھا وما بَطَنَ" (الانعام: ۱۵۱) میں ہے (یعنی بے حیائیوں کے قریب بھی نہ جاؤ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں) پھر اسی سے اس فعل میں "پھیل جانا، عام ہو جانا یا بکثرت ہونا" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے جیسے ظھر الفسادُ فی البر والبحرِ (الروم: ۴۱) میں ہے (یعنی فساد پھیل گیا خشکی اور سمندر (تری) میں) کبھی یہ بطور فعل متعدی "... پر چڑھنا" کے معنی دیتا ہے مثلاً کہتے ہیں "ظھَرَ الجبَلَ = وہ پہاڑ پر چڑھ گیا" اور قرآن میں ہے "فَمَا اسْطاعوا اَن یظھروہ (الکہف: ۹۷) یعنی وہ اس پر چڑھ نہیں سکتے۔ "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی "... پر غلبہ پانا" اور "... سے آگاہ ہونا" بھی ہوتے ہیں جیسے "وان یظھروا علیکم (التوبہ: ۸) میں ہے (یعنی اگر وہ تم پر غلبہ پالیں) اور "اوالطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء (النور: ۳۱) میں ہے (یعنی وہ لڑکے جو عورتوں کی شرم کی چیزوں سے آگاہ نہیں ہوئے)۔ اس فعل مجرد کے یہ (مذکورہ بالا) وہ معنی ہیں جو قرآن کریم میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ فعل مجرد (اسی باب سے مگر مختلف مصادر کے ساتھ) کچھ اور معانی بھی دیتا ہے جو کتب لغت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغے دس جگہ آئے ہیں اور مزید فیہ کے ابواب اِفعال، مفاعلہ اور تفاعل سے مختلف صیغے ۱۶ جگہ آئے ہیں اس کے علاوہ متعدد مشتق اور ماخوذ کلمات (مثلاً ظَھرُ، ظُھُور، ظاھر، ظھیر وغیرہ) تیس سے زائد مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ ان سب پر حسب موقع بات ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ (تظاھرون) اس مادہ سے تفاعل کا صیغہ مضارع جمع مذکر حاضر ہے۔ اس باب سے فعل "تظاھر یتظاھر تظاھُرًا" کے معنی ہیں "باہم ایک دوسرے کی مدد کرنا، تعاون کرنا"۔ [اوپر فعل کے لیے واحد کی بجائے تثنیہ (ماضی و مضارع) کے صیغے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس فعل (اور عموماً باب تفاعل کے ہر فعل) کا فاعل ایک آدمی نہیں ہوتا۔ کم از کم دو آدمی (یا زیادہ بصیغۂ جمع) ہوتے ہیں]

اور جب اس فعل کے بعد" علی" کا صلہ آئے تو اس کا مطلب ہوتا ہے"کسی کے خلاف باہم ایک دوسرے کی مدد کرنا" مثلاً کہیں گے : "تظاهروا علی فلان" (ان سب نے فلاں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی یعنی اس کے مخالفوں کی مدد کی)، بابِ تفاعل کے اس فعل کے کل دو صیغے قرآن کریم میں تین جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ اسی طرح "علی" کے صلہ کے ساتھ آئے ہیں۔

● اس طرح اس عبارت (تظاهرون علیهم) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے"تم باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ان کے خلاف" یا "تم مددگاری کرتے ہو ان پر" پھر اسے بامحاورہ بنانے کے لیے "ان کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو" یا "ان کے مقابلے میں (ان کے مخالفوں کی) مدد بھی کرتے ہو" کی صورت میں ترجمہ کیا گیا ہے' اسی لیے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "ان پر چڑھائی کرتے ہو" کے ساتھ کیا ہے جسے بلحاظ مفہوم ہی درست کہا جا سکتا ہے اور چونکہ اس باہمی مخالفانہ مدد کا تعلق ان کو گھروں سے نکالنے (تخرجون فریقاً منکم من دیارهم۔ سابقہ عبارت) سے ہے اس لیے بعض نے یہاں زیرِ مطالعہ عبارت کے صیغہ مضارع کو "حال" کے معنی میں لے کر ترجمہ "ایک دوسرے کے مددگار بن کر (ان کو نکالتے ہو)" کی صورت میں بھی کیا ہے اس پر مزید بات حصہ "الاعراب" میں ہوگی۔

۲ : ۵۲ : ۱ (۴) [بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ] ابتدائی "باء (بِ) کا ترجمہ یہاں" کے ساتھ" سے" یا "میں" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ باقی دو لفظ "الاثمِ" اور "العدوانِ" ہیں (جو یہاں مجرور بالجر ہیں) ان کی لغوی وضاحت الگ الگ کی جاتی ہے۔

(۱) "اَلِاثْمُ" کا مادہ "ا ث م" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فِعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "اَثِمَ یَاْثَمُ اِثْماً و اَثَاماً" (سمع سے) کے معنی ہیں "گناہ گار ہونا۔ کوئی ایسا کام کرنا جو جائز اور حلال نہ ہو"۔ اور "اثَمَ یاثُمُ" (نصر سے) کے معنی ہوتے ہیں "کسی کام کو گناہ قرار دینا اور اس کی سزا دینا" کہتے ہیں : "یَاْثُمُہ اللّٰہُ" (اللہ اسے گناہ گار قرار دے گا) اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی مختلف معانی کے لیے فعل استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس مادہ سے مشتق اور ماخوذ بعض کلمات (مثلاً اثم، اثام، آثم، اثیم، تأثیم وغیرہ) پچاس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ ان سب پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "اِثم" (جو معرفہ نکرہ مفرد مرکب مختلف صورتوں اور حالتوں میں قرآن کریم کے اندر

تیس۳۰ سے زیادہ مقامات پر آیا ہے) فعل مجرد کا مصدر بھی ہے اور اس سے اسم بھی ہے جس کے معنی ہیں "ایسا بُرا کام جس پر آدمی سزا کا مستحق ہو جائے"۔ بقول راغب "ایسا کام جو ثواب اور خیرات یعنی بھلائیوں سے پیچھے رہ جانے یا در کرنے کا سبب ہو"۔ اس کا سادہ اردو ترجمہ ایک لفظ "گناہ" سے کیا جا سکتا ہے۔ عربی میں اس کے مقابلے کا لفظ "بِرّ" (نیکی) ہے۔ اگرچہ گناہ اور نیکی کے لیے عربی زبان میں ۔ اور خود قرآن کریم میں بعض دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ عموماً "اثم" ایسے بُرے کام کو کہتے ہیں جس کا تعلق صرف گناہ کار کی ذات سے ہو بظاہر کسی دوسرے آدمی کا نقصان یا کسی پر ظلم اس میں شامل نہ ہو۔

(۲) "العُدْوَان" کا مادہ ع د و اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فُعْلَانٌ" ہے اس سے فعل مجرد (عدا یعدُو۔ دوڑنا) پر البقرہ: ۳۶ [۲: ۲۶: ۱ (۱۹)] میں کلمہ "عَدُوٌّ" (دشمن) کے ضمن میں بات ہو لی تھی۔ یہ فعل مختلف معانی کے لیے مختلف مصادر کے ساتھ (ایک ہی باب سے) استعمال ہوتا ہے بقول راغبؒ اس مادہ (عدو) میں بنیادی مفہوم "تجاوز" (کسی حد سے آگے بڑھنا) اور عدم "القیام" (اکٹھے اور یکجا نہ رہ سکنا) کا ہوتا ہے پھر اگر "مَشْیٌ" (پیدل چلنے) سے تجاوز ہو تو اسے "عَدْوٌ" (دوڑنا) کہتے ہیں اور اگر دلی موافقت سے تجاوز ہو تو اسے "عداوۃٌ" (دشمنی) کہتے ہیں۔ اور اگر کسی معاملہ میں انصاف سے تجاوز ہو تو اسے "عُدْوَانٌ" (زیادتی۔ظلم) کہتے ہیں۔ البتہ ان آخری معنوں کے لیے فعل مجرد کے ساتھ "علی" کا صلہ آتا ہے مثلاً کہتے ہیں "عدا علیہ" = (اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ یا اس پر ظلم کیا)۔ اس طرح یہ فعل (عدا یعدُو) لازم متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ "عُدْوَان" ایسے بُرے کام یا گناہ کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسرے آدمی کے حقوق وغیرہ کا نقصان شامل ہو۔ یعنی "ظلم و زیادتی"۔

● اس طرح "اثم و عدوان" میں برائی اور گناہ کی تمام صورتیں آجاتی ہیں جسے اردو مترجمین نے "گناہ اور ظلم" یا "گناہ اور زیادتی" سے تعبیر کیا ہے۔ ان (زیادتی اور ظلم والے) معنی کے لیے اس مادہ (عدو) سے باب افتعال اور تفعل کے فعل بھی استعمال ہوتے ہیں، یہ بھی آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے۔

۲: ۵۲: ۱ (۵) [وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ] (عبارت میں کلمات کی ساخت کی شناخت کے لیے "اُسٰرٰی" اور "تُفٰدُوْھُم" کو رسم املائی کے مطابق ہی لکھا گیا ہے۔ ان کے قرآنی رسم (عثمانی) پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) ابتدائی "وَ" عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور "اِنْ" شرطیہ (بمعنی "اگر") ہے۔ "یَاْتُوْکُمْ"

کی آخری ضمیر منصوب (کُمْ) یہاں بمعنی "تمہارے پاس" ہے اور صیغۂ فعل "یَأْتُوْا" (ضمیر منصوب یعنی مفعول کے بغیر صیغۂ فعل میں واو الجمع کے بعد زائد الف لکھا جاتا ہے جسے الف الوقایۃ بھی کہتے ہیں) کا مادہ "أ ت ی" اور وزنِ اصلی "یَفْعِلُوْا" ہے۔ اس کی اصلی شکل "یَأْتِیُوْا" تھی جس میں واو الجمع سے ماقبل حرفِ علت (جو یہاں "ی" ہے) گرا کر اس کے ماقبل (جو یہاں "ت" ہے) کی حرکت کسرہ (ـِـ) ضمہ (ـُـ) میں بدل دی جاتی ہے اور یوں یہ لفظ "یَأْتُوْا" بنتا ہے۔ اس قسم کے متعدد صیغہ ہائے فعل پہلے گزر چکے ہیں

● اور یہ لفظ (یَأْتُوْا) اس مادہ (أ ت ی) کے فعل مجرد (اَتی یَأْتِیْ = آنا) سے فعل مضارع مجزوم کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے جو دراصل تو "یَأْتُوْنَ" (مندرجہ بالا تعلیل کے بعد) بنتا تھا مگر شروع میں "اِنْ" شرطیہ کے لگنے سے مجزوم ہو کر آخری "ن" گر گیا ہے۔ فعل مجرد "اتی یاتی" کے باب معنی اور استعمال پر سب سے پہلے البقرۃ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۴)] میں اور پھر [۲:۱۸:۱(۷)] میں بھی بحث ہو چکی ہے۔

● اس طرح "وَاِنْ یَّأْتُوْکُمْ" کا لفظی ترجمہ ہے "اور اگر وہ آتے ہیں تمہارے پاس" جسے بعض نے "اگر وہ تم تک پہنچ جاتے ہیں" سے ترجمہ کیا ہے کیونکہ آگے ان کے قید ہو کر "آنے" کا ذکر ہے اس صورتِ حال کے لیے "آنے" کی بجائے "پہنچ جانا" موزوں ترجمہ ہے۔ بعض نے فعل مضارع کے ساتھ ہی ترجمہ "آئیں / آویں" کی صورت میں کیا ہے۔ جب کہ بعض نے عبارت کے مجموعی مضمون کو سامنے رکھتے ہوئے (جس میں "ان" کو قتل کرتے اور گھروں سے نکالتے بھی ہیں اور پھر قیدی ہو کر آئیں تو ان کو چھڑاتے بھی ہیں۔ کا ذکر ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے) یہاں "اگر وہ" کی بجائے "اگر وہی / وہی لوگ" سے ترجمہ کیا ہے (یعنی وہی جن کے قتل اور جلاوطنی کے مرتکب ہوتے ہو)۔ بعض حضرات نے بصورت واحد (وہ آئے) ترجمہ کیا ہے جو اصل عبارت کے خلاف ہے۔

● "اساری" کا مادہ "ا س ر" اور وزن "فُعَالٰی" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "أَسَرَ ... یَأْسِرُ اَسْرًا" (ضرب سے) کے بنیادی معنی ہیں "کسی چیز (خصوصاً کجاوہ وغیرہ) کو مضبوطی سے باندھ دینا" پھر یہ مطلقاً "کسی کو قیدی بنا لینا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی اس کا زیادہ استعمال "کسی کو جنگ میں قیدی بنا لینا" کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے (جنگی) قیدی کو عربی میں "اَسِیْر" (بروزن "فَعِیْل") کہتے ہیں۔ (جیل کے قیدی کے لیے لفظ "مَسْجُوْنٌ" استعمال ہوتا ہے)۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے مضارع کا ایک صیغہ ایک ہی جگہ (الاحزاب: ۲۶) میں آیا ہے اس کے علاوہ اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق اسماء (اَسْرٌ، اسیرٌ، اَسْریٰ واساری) کئی جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ (اُسَارٰی) جمع مکسر ہے جس کا واحد "اَسِیْرٌ" (بمعنی قیدی) ہے لفظ "اَسِیر" کی ایک

جمع "أُسَارٰی" بھی ہے (یہ بھی قرآن کریم میں مذکور ہے) اردو میں لفظ "قیدی" واحد جمع دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے (قیدی آیا۔ قیدی آئے) اس لیے یہاں "اساریٰ" کا ترجمہ "قیدی" ہی کیا گیا ہے البتہ (جیسا کہ آگے "الاعراب" میں بیان ہوگا) یہاں چونکہ لفظ "اساریٰ" حال ہو کر آیا ہے اس لیے "اساریٰ" کا ترجمہ "قیدی ہو کر، قیدی بن کر، قید ہو کر، اسیر ہو کر" کیا گیا ہے۔ بعض نے یہی مفہوم "گرفتار ہو کر" "بندی وان ہو کر" اور "کسی کی قید میں پڑے (ہوئے)" سے ظاہر کیا ہے۔

● "تُفَادُوْهُمْ" کی آخری ضمیر منصوب "ھم" (بمعنی "ان کو") ہے اور باقی صیغہ فعل "تُفَادُوْا" (ضمیر مفعول ہٹانے کے بعد واو الجمع کے ساتھ الف الوقایہ لکھنا ضروری ہے) کا مادہ "ف د ی" اور وزن اصلی "تُفَاعِلُوْا" ہے اصلی شکل "تُفَادِيُوا" تھی جس میں واو الجمع سے ماقبل حرف علت (ی) گر کر اس سے پہلے کے حرف (عین کلمہ "د") کی کسرہ ضمہ میں بدل دی جاتی ہے (یعنی ـِ یُ وْ = ـُ وْ)۔ اور یوں یہ لفظ "تُفَادُوا" بنتا ہے جو دراصل اس مادہ (ف د ی) سے باب مفاعلہ کا فعل مضارع مجزوم (صیغہ جمع مذکر حاضر) ہے یعنی یہ "تُفَادُوْنَ" تھا جس کا آخری "ن" بوجہ جزم گر گیا ہے ("جزم" کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)

● اس مادہ (ف د ی) سے فعل مجرد "فَدَی ... یَفْدِی فِدَاءً" (ضرب سے) کے معنی ہیں "... کو (مال وغیرہ دے کر قید وغیرہ سے) چھڑا لینا" جس کو چھڑایا جائے وہ بطور مفعول بنفسہ آتا ہے اور جو چیز اس کے عوض یا بدلے میں دی جائے اس سے پہلے "باء" (ب) کا صلہ آتا ہے مثلاً کہیں گے "فَدَی فُلَانًا بِمَالِهٖ" (اس نے فلاں کو اپنے مال کے عوض چھڑا لیا)۔ اس فعل مجرد سے صرف ایک صیغہ ماضی ایک ہی جگہ (الصافات: ۱۰۷) وارد ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے باب مفاعلہ اور افتعال سے افعال کے مختلف صیغے آٹھ جگہ اور لفظ "فداء" اور "فِدْیَة" بھی چار مقامات پر آئے ہیں، ان پر حسب موقع بحث ہوگی ان شاء اللہ

● زیر مطالعہ لفظ "تُفَادُوا" اس مادہ سے باب مفاعلہ کے فعل مضارع مجزوم کا صیغہ (جمع مذکر حاضر) ہے۔ اس باب سے فعل "فادی ... یُفَادِیُ مُفَادَاةً وفِدَاءً" کے معنی ہیں "کوئی چیز عوض میں دے کر ... کو چھڑا لینا" یعنی یہ فعل مجرد والے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے ایک معنی "باہم قیدیوں کا تبادلہ کر لینا" بھی ہیں یعنی "اپنے پاس موجود قیدی دے کر مخالف سے اپنے آدمی (جو وہاں قید ہیں) چھڑوا لینا"۔ قرآن کریم میں باب مفاعلہ کا یہ فعل صرف اسی ایک جگہ استعمال ہوا ہے۔

یوں "تفادوھم" کا لفظی ترجمہ ہے "تو تم عوض دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو" ——— اور اسی مفہوم

کو' تم ان کو چھڑوائی دیتے ہو/ تم چٹی بھر کر ان کو چھڑواتے ہو/ بدلہ دے کر چھڑاتے ہو/ کچھ خرچ کر کے رہائی دلا لیتے ہو/ رہا کرا دیتے ہو' کی صورت میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ خیال رہے "کچھ دینا" اور "چھڑا لینا" دونوں مفہوم باب مفاعلہ کے اس فعل کے اندر شامل ہیں۔

● یوں اس پوری عبارت "وانِ یأتوکم اُسارٰی تفادوھم" کا ترجمہ بنتا ہے "اور اگر وہ (ہی) تمہارے پاس آجائیں قیدی ہو کر تو تم ان کو بدلے میں کچھ دے کر چھڑا (بھی) لیتے ہو" ترجمہ میں "ہی" اور "بھی" لانے کی وجہ اوپر بیان ہوئی ہے بلکہ الگ الگ اجزائے عبارت کے الگ الگ معانی (تراجم) بھی لکھے گئے ہیں جن کو سامنے رکھتے ہوئے آپ اس عبارت کا بامحاورہ ترجمہ کسی طرح سے کر سکتے ہیں۔ یا مختلف تراجم میں مترجم کے انتخابِ الفاظ کی وجہ سمجھ سکتے ہیں۔

۲:۵۲:۱(۶) [وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ] اس جملہ میں صرف "مُحَرَّمٌ" نیا لفظ ہے باقی کلمات پہلے گزر چکے ہیں مثلاً "وَ" (جو یہاں بمعنی "حالانکہ" ہے) کے لیے دیکھئے [۱:۴:۱(۳)] "هُوَ" (ضمیر واحد مذکر غائب بمعنی "وہ" ہے) "علیکم" (تم پر) جار مجرور ہے اور "اِخراجھم" (اُن کو نکال دینا) کے پہلے حصے (اِخْرَاج) پر (جو "خ ر ج" مادہ سے بابِ افعال کا مصدر ہے) اس سے پہلے البقرۃ:۲۲ [۲:۱۶:۱(۱۱)] میں بات ہو چکی ہے۔ اور نئے لفظ [مُحَرَّمٌ] کا مادہ "ح ر م" اور وزن "مُفَعَّلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "حَرَمَ ... یَحْرِمُ حِرْمَانًا" (ضرب سے) کے معنی ہیں: "... کو ... سے روک دینا" یعنی اس کے دو مفعول ہوتے ہیں جس کو روکا جائے اور جس سے روکا جائے اور دونوں مفعول بنفسہٖ آتے ہیں مثلاً کہیں گے "حَرَمَ فلانًا الشیئَ" (اس نے فلاں کو چیز سے روک دیا) جس سے کوئی چیز روک دی جائے اسے "مَحْرُوم" (بصیغہ اسم مفعول) کہتے ہیں جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ باب کرم سے فعل (مثلاً حَرُمَ الشیئُ) کے معنی "ممنوع ہونا" ہوتے ہیں اور اس کا مصدر "حُرْمَةٌ" ہوتا ہے (جو "حُرمت" کی املاء کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے)۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے کسی طرح کا (اور کسی باب سے) کوئی صیغہ فعل استعمال نہیں ہوا۔

● زیر مطالعہ لفظ (مُحَرَّم) اس مادہ سے باب تفعیل کا صیغہ اسم المفعول ہے۔ باب تفعیل سے فعل "حَرَّمَ ... یُحَرِّمُ تَحْرِیمًا" کے معنی ہیں: "... کو حرام قرار دینا" (خود "حرام" کا لفظ جو اسی مادہ سے ماخوذ ہے اردو میں رائج ہے اور "حرام" کے معنی بھی ایسی چیز ہیں جس کے استعمال سے یا جس کی بے حرمتی سے روک دیا جائے")۔ اس فعل (حَرَّمَ یُحَرِّمُ) کے بھی دو مفعول ہوتے ہیں: جو چیز حرام کی جائے اور جس پر حرام کی جائے۔ پہلا مفعول براہِ راست بغیر کسی صلہ کے (بنفسہٖ) آتا ہے اور دوسرے مفعول سے

پہلے "علیٰ" کا صلہ آتا ہے جیسے "حرّم علیکم المیتۃ" (البقرہ:۱۷۳) میں ہے (یعنی اس نے حرام کر دیا تم پر مردار) البتہ کبھی دوسرا مفعول محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے جیسے "وحرّم الربٰوا" (البقرۃ:۲۷۵) میں ہے (یعنی اس نے سود حرام قرار دیا)۔ دراصل اس فعل میں بھی وہی "روک دینے" اور "منع کر دینے" کا مفہوم موجود ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں باب تفعیل کے اس فعل سے مختلف صیغہ ہائے فعل چالیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ اور ان کے علاوہ اس مادہ (ح ر م) سے ماخوذ مشتق کلمات (حَرَمٌ، حُرُمٌ، حَرام، حُرُمَات، محرُوم، محرّمٌ وغیرہ) بھی چالیس سے زائد جگہ وارد ہوئے ہیں جن پر اپنی اپنی جگہ مزید بات ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● اس طرح لفظ "محرّم" کے معنی تو بنتے ہیں "حرام کیا ہوا" جسے اردو میں صرف "حرام" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے بیشتر مترجمین نے یہاں "محرّم علیکم" کا ترجمہ "تم پر حرام تھا/ہے" سے ہی کیا ہے بعض نے "ممنوع ہے" اور "روا نہ تھا" سے ترجمہ کیا ہے مفہوم وہی ہے البتہ جن حضرات نے "حرام کر دیا تھا" سے ترجمہ کیا ہے وہ اصل عبارت سے تجاوز ہے کیونکہ یہ تو "حَرّمَ" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے یوں اس پوری عبارت (وھو محرّم علیکم اخراجُھم) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "حالانکہ وہ حرام (کیا ہوا) ہے (یا تھا) تم پر نکال دینا ان کو"۔ جس کا بامحاورہ بنتا ہے "حالانکہ وہ ہی (یعنی) ان کو نکال دینا تم پر حرام (تھا/ہے)" اسی کو بعض نے "نکال دینا ہی/نکال دینا بھی" سے ترجمہ کیا ہے اس میں "ہی" یا "بھی" لانے کی وجہ واو الحال کے ساتھ ضمیر مرفوع "ھُوَ" اور پھر اس کے بدل "اِخراجُھُمْ" کا استعمال ہے۔ اس پر مزید بات آگے "الاعراب" میں ہو گی۔

[فَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ] اس جملے کے تمام کلمات (افعال، اسماء اور حروف) کے معانی اور ان کی لغوی تشریح کئی دفعہ پہلے گزر چکی ہے مثلاً ① ابتدائی "اَفَ" (کیا پس) کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اگر "فَ" کے ساتھ استفہام (سوال) کے لیے ہمزۂ استفہام (اَ) استعمال ہو تو ہمزہ پہلے اور "فاء" بعد میں آتی ہے یعنی (اَفَ....)۔ اور اگر استفہام کے لیے "اَ" کی بجائے "ھَلْ" لگے تو "فاء" پہلے اور "ھَلْ" بعد میں استعمال ہوتا ہے (یعنی فھَلْ...) مطلب دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

② تُؤْمِنُوْنَ بِ.... (جو ام ن سے باب افعال آمن یُؤمِنُ = ایمان لانا، کا صیغہ مضارع جمع مذکر حاضر ہے) کے مادہ، باب، معنی اور اس کے ساتھ "باء (ب)" کے صلہ کے استعمال وغیرہ کی مفصل بحث البقرہ: ۳ [۲:۲:۱(۱)] میں گزر چکی ہے یعنی "تم ایمان رکھتے ہو.... پر"۔

③ "بعض الکتاب" (کتاب کا بعض یعنی کچھ حصہ)۔ ویسے تو "بعض" اردو میں بھی مستعمل ہے تاہم اس

کی مزید لغوی تشریح کے لیے چاہیں تو [۲:۱۹:۱(۳)] اور [۲:۲۶:۱(۱۸)] پر نظر ڈال لیجئے۔ اسی طرح "الکتاب" (جس سے مراد یہاں آسمانی کتاب ہے) کی مکمل لغوی تشریح [۲:۱:۱(۲)] میں گزر چکی ہے۔

④ "وَتکفرُون بِ..." (جو "ک ف ر" مادہ سے باب نصر کا صیغہ مضارع ہے) کے معنی اور اس کے ساتھ "باء" (ب) کے بطور صلہ استعمال کی بابت چاہیں تو [۲:۵:۱(۱)] اور [۲:۱۴:۱(۱۴)] میں دیکھ لیجئے = یہاں یہ "تم انکار کرتے ہو یا کفر کرتے ہو... سے" کے معنی میں آیا ہے۔

⑤ "بعضٍ" کا ترجمہ تو مشکل نہیں البتہ اس کے یہاں "نکرہ" آنے کی وجہ پر "الاعراب" میں بات ہوگی۔

● یوں اس عبارت (افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعضٍ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "کیا پھر تم ایمان لاتے/رکھتے ہو کتاب کے بعض (یعنی کچھ حصہ) پر اور/حالانکہ انکار کرتے/کفر کرتے ہو تم کسی بعض (حصہ) کا"۔ بامحاورہ ترجمہ کے لیے "بعض" کا ترجمہ "ایک حصہ، بعض احکام، بعض بات، کچھ حکموں" سے کیا گیا ہے جس میں "احکام، حکموں یا باتیں" تفسیری اضافے ہیں مثلاً "کتاب کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے" کیونکہ "کفرَ یکفر = انکار کرنا" کا ہی ترجمہ "نہ ماننا"، "ایمان نہ رکھنا" سے بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "بعض احکام/ایک حصے کو مانتے ہو اور بعض احکام/ایک حصے کا انکار کرتے ہو"۔ اسی طرح "کچھ مانتے ہو اور کچھ نہیں مانتے" یا "کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے" کی صورت میں بھی یہی مفہوم نسبتاً کم الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲:۵۲:۱(۷) [فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا] اس عبارت میں لغوی لحاظ سے نیا تشریح طلب لفظ "خِزیٌ" ہے۔ باقی الفاظ کی لغوی تشریح براہِ راست یا بالواسطہ اس سے پہلے گزر چکی ہے مثلاً ① "فمَا" کی "فاء" کا مطلب یہاں "تو پھر" ہے اس "فَ" کے معانی کے لیے دیکھئے [۲:۱۶:۱(۱۰)] "مَا" یہاں استفہامیہ (بمعنی کیا؟) بھی ہو سکتا ہے اور نافیہ (بمعنی "نہیں" ہے) بھی۔ مَا کے مختلف استعمالات کے لیے چاہیں تو [۲:۲:۱(۵)] کے علاوہ [۲:۱۹:۱(۲)] — اور [۲:۴۷:۱(۵)] بھی دیکھ لیجئے۔

② "جزاءُ" (جو یہاں بوجہ اضافت خفیف ہے) کا مادہ "ج ز ی" اور وزن "فَعَالٌ" ہے یہ دراصل "جَزَایٌ" تھا پھر الف ممدودہ کے بعد والی "ی" (اور "و" بھی) ہمزہ (ء) میں بدل کر لکھی بولی جاتی ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (جزَی یجزِی = بدلہ دینا) کے باب و معنی اور صلہ اور بغیر صلہ کے استعمال پر البقرہ: ۴۸ [۲:۳۱:۱(۲)] میں بات ہوئی تھی۔ لفظ "جزاءٌ" اس فعل کا مصدر بھی ہے اور بطور

اسم" جزا، سزا، بدلہ" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

③ "مَنْ" یہاں موصولہ (بمعنی "جو کوئی کہ، جو کوئی) ہے" مَنْ" کے مختلف استعمالات پر البقرہ: ۸ [۲:۷:۱ (۴)] میں بات ہوئی تھی۔

④ "یَفْعَلُ" (جو فعل یفعل "کرنا" سے فعل مضارع کا پہلا صیغہ ہے) اس کے معنی وغیرہ البقرہ: ۲۴ [۲:۱۷:۱ (۱۱)] بیان ہوئے تھے۔

⑤ "ذٰلِكَ" (بمعنی "وہ") کی وضاحت کے لیے [۲:۱:۱ (۱)] پر نظر ڈال لیجئے!

⑥ "مِنْكُمْ" جار مجرور (بمعنی تم میں سے") ہے۔ حرف الجر "مِنْ" کے استعمالات و معانی بحث استعاذہ میں اور پھر البقرہ: ۳ [۲:۲:۱ (۵)] میں دیکھ لیجئے۔

⑦ "اِلَّا" حرف استثناء (بمعنی "مگر، سوا، بجز") کی وضاحت [۲:۸:۱ (۳)] میں گزر چکی ہے۔

⑧ [خِزْيٌ] (جو یہاں پہلی دفعہ آیا ہے) کا مادہ "خ ز ی" اور وزن "فِعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "خَزِیَ یَخْزَی خِزْیًا" (سمع سے) کے معنی ہیں: "رسوا ہونا۔ ذلیل ہو جانا"۔ اور اسی باب سے مگر "خَزَایَةٌ" مصدر کے ساتھ اس فعل کے معنی "شرمانا، شرمندگی محسوس کرنا" ہوتے ہیں۔ بعض کتب لغت (مثلاً لسان العرب اور المعجم الوسیط) میں اسے "خ ز و" مادہ سے لیا گیا ہے گویا یہ ایسا ہے جیسے "رضو" مادہ سے باب سمع میں "رَضِیَ" ہو جاتا ہے جب کہ بعض (مثلاً القاموس المحیط اور البستان) میں "خ ز و" الگ مادہ (اور اس سے فعل خَزَا یَخْزُو (نصر کے معنی "مطیع کرنا" ہیں) شمار کیا ہے اور "خ ز ی" الگ مادہ قرار دیا ہے جو باب سمع سے مندرجہ بالا دو معانی (رسوا ہونا/شرمانا) کے لیے آتا ہے۔ قرآن مجید میں اس فعل مجرد (خَزِیَ یَخْزَی) سے صرف ایک جگہ (طٰہٰ: ۱۳۴) ایک صیغہ مضارع (تَخْزٰی) آیا ہے اور "رسوا ہونا" والے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ باب افعال سے مختلف صیغے ۱۲ جگہ اور خود زیر مطالعہ لفظ (خِزی) ۱۱ جگہ اور اس سے افعل التفضیل (أَخْزٰی) اور باب افعال کا اسم الفاعل (مخزی) بھی ایک ایک جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "خِزْیٌ" فعل مجرد کا مصدر ہے اور بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے متعدد معانی ہیں مثلاً "رسوائی، ذلت، ندامت، بے عزتی، آفت زدگی"۔ اس کے علاوہ بعض دفعہ یہ "بربادی" اور "سزا" کے معنی بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ زیادہ تر "رسوائی" اور "ذلت" والے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

⑨ "فِي" (جس کا عام ترجمہ "میں" ہے) کے بطور حرف الجر و بطور صلہ استعمال پر [۲:۱:۱ (۵)] اور پھر

[۲:۱۴:۱۱ (۴)] میں بات ہوئی تھی۔

(۱۰) "الحیوۃ" کا مادہ "ح ی ی" اور وزن اصلی (لام تعریف کے بغیر) "فَعَلَۃٌ" ہے اصلی شکل "حَیَیَۃٌ" تھی جس میں (دوسری) یائے متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لفظ "حَیَاۃٌ" بنتا ہے تاہم یہ لفظ قرآن کریم میں "حَیٰوۃ" لکھا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ "و" تفخیم کے لیے (ی کو پُر کر کے پڑھنے کے لیے) لکھی جاتی ہے اور یہ اہل یمن کے طریق تلفظ اور طریق کتابت کے مطابق ہے۔ البتہ قرآن کریم میں بھی جب یہ لفظ مضاف ہو کر آئے تو الف سے ہی لکھا جاتا ہے جیسے "حیاتی" میں اس لفظ (حیوۃ) کا اردو ترجمہ "زندگی" سے ہی کیا جاتا ہے۔ اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد کی بحث البقرہ ۲۶، [۲:۱۹:۱ (۱)] کلمہ "یستحیی" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

(۱۱) "الدنیا" کا مادہ "د ن و" اور وزن (لام تعریف کے بغیر) "فعلی" ہے گویا یہ دراصل "دُنْوٰی" تھا جس میں خلاف قیاس ایک تو "و" کو "ی" میں بدل دیا جاتا ہے اور پھر آخری "یاء" کو (جو الف مقصورہ ہی تھی) لکھا بھی "الف" کی شکل میں جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کی دو صورتوں باب نصر سے "دنا یَدْنُو" (قریب ہونا) اور باب سمع سے "دَنِیَ یَدْنٰی" (گھٹیا ہونا) پر اس سے پہلے البقرۃ ۶۱ [۲:۳۹:۱ (۱۰)] میں کلمہ "ادنی" کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔

● کلمہ "دُنیا" اسی "اَدْنٰی" کا صیغہ مؤنث (افعل التفضیل) ہے جسے اگر فعل "دنا یدنُو" سے لیں تو اس کا مطلب "نزدیک ترین" بنتا ہے اور اگر اسے "دَنِیَ یَدْنٰی" سے لیں تو اس کا مطلب "سب سے گھٹیا/کمترین" بنتا ہے۔ اور اس صورت میں اس (دُنیا) کی اصلی شکل بھی "دُنْیٰی" (بروزن فُعْلٰی) ہو گی کیونکہ لام کلمہ (و) فعل مجرد میں ہی "ی" میں بدل گئی تھی ("دَنِوَ" ہی "دَنِیَ" بن گیا تھا) اور یوں "دُنْیٰی" کی صرف املا ہی "دُنیا" ہو جاتی ہے۔

● دونوں صورتوں میں لفظ "الدنیا" سابقہ لفظ "الحیوۃ" (زندگی) کی صفت ہے یعنی "نزدیک ترین زندگی" (بمقابلہ "آخرۃ" یعنی سب سے آخر پر آنے والی زندگی) یا "کم ترین یا گھٹیا زندگی" (آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں گھٹیا نعمتوں والی)۔ تاہم اردو میں اس کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جاتا صرف "دنیوی زندگی" ہی کہتے ہیں بلکہ اردو محاورے کی بنا پر اس کا ترجمہ مرکب توصیفی کی بجائے (جیسا کہ وہ اصل عربی میں ہے) مرکب اضافی کی شکل میں یعنی "دنیا کی زندگی" سے ہی کر دیا جاتا ہے۔

● اس طرح مندرجہ بالا مفردات کے الگ الگ معانی و ترجمہ بیان ہو چکنے کے بعد اور ان کی روشنی میں زیر مطالعہ پوری عبارت (فما جزاء من یفعل ذلک منکم الا خزیٌ فی الحیوۃ الدنیا) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے

ملیس کیا ہے (یا نہیں ہے) بدلہ اس کا جو کرے وہ تم میں سے مگر رسوائی ہی دنیوی (یا دنیا کی) زندگی میں بھی) مطلب اور مفہوم یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی سزا دنیا میں بھی ذلت ہی ہے۔ بیشتر مترجمین نے ابتدائی "فما" کا ترجمہ استفہام کے ساتھ (کیا سزا، کیا بدلہ) کیا ہے بعض نے "ما نافیہ" کے ساتھ (کوئی سزا نہیں کچھ سزا نہیں) ترجمہ کیا ہے تاہم "اِلاَّ" (مگر سوائے اس کے کہ) کے آنے سے دونوں کا مفہوم ایک ہی بنتا ہے "یعنی صرف یہی سزا ہے کہ"۔ اسی طرح بعض نے "خِزْیٌ" کا ترجمہ "رسوائی" کی بجائے "کہ رسوا ہو" سے کیا ہے جو اصل لفظ سے تجاوز ہے گو مفہوم درست ہے۔ اسی طرح "یفعل ذٰلک" (... کرے وہ) کا وضاحتی ترجمہ "ایسا کرے، ایسی حرکت کرے، یہ کام کرے" سے کیا گیا ہے جو محاورے کا تقاضا تھا۔ اور بعض نے "الحیٰوۃ الدنیا" کا ترجمہ صرف "دنیا" ہی کیا ہے اسے بھی محاورہ و مفہوم کی بنا پر ہی درست کہا جا سکتا ہے۔

۲: ۵۲: ۱ (۸) [وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ] اس عبارت میں بھی (جو ایک مکمل جملہ ہے) نیا لفظ "یُرَدُّوْنَ" ہے۔ باقی کلمات یا تو اپنی اسی شکل میں پہلے گزر چکے ہیں (مثلاً "وَ"، "یَوْم، اِلٰی، اشد اور العذاب) یا جس مادہ سے وہ ماخوذ ہیں اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (مثلاً "القیامۃ") یہاں ہم نمبروار تمام کلمات کا ترجمہ لکھے دیتے ہیں اور مزید لغوی تشریح کے لیے گزشتہ حوالے دیتے جائیں گے۔ یا جہاں ضروری ہوا مزید وضاحت کرتے جائیں گے مثلاً

① "وَ" یہاں بمعنیٰ "اور" ہے اس (وَ) کے مزید معانی کے لیے دیکھئے [۱: ۴: ۱ (۳)]

② "یومَ القیامۃِ" (جو مرکب اضافی ہے) کے پہلے جزء (یَوْم بمعنیٰ دن) کی لغوی تشریح [۱: ۳: ۱ (۲)] میں "یوم الدین" کے سلسلے میں گزر چکی ہے۔ دوسرے جزء "القیامۃ" (جو یہاں برسم املائی لکھا گیا ہے اس کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) کا مادہ "ق و م" اور وزن اصلی "فِعَالَۃٌ" ہے گویا یہ دراصل "قِوَامَۃٌ" تھا جس میں واوِ مفتوحہ ماقبل مکسور "ی" میں بدل کر لکھی اور بولی جاتی ہے یعنی ـِوَ = ـِیَ۔ اس مادہ سے فعل مجرد (قام یقوم = کھڑا ہونا) کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ: ۶ [۱: ۵: ۱ (۴)] میں کلمہ "مستقیم" کے ضمن بات ہو چکی ہے۔

● کلمہ "قیامۃ" بھی "قَوْمَۃٌ" اور "قیامٌ" کی طرح فعل "قَامَ یقُوم" کا ایک مصدر ہے جس کا مطلب ہے "کھڑا ہو جانا" (اس کی ضد "قَعَدَ" (بیٹھ جانا) ہے) یوں "یوم القیامۃ" کا مطلب ہوا "کھڑے / یا اٹھ کھڑے ہونے کا دن"۔ قرآن کریم کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب "مرنے کے بعد دوبارہ زندہ (ہو کر کھڑے) ہونے کا دن" ہے۔ تاہم لفظ "قیامت" اردو زبان میں (لمبی "ت" کی املاء کے ساتھ) مستعمل اور متعارف

ہے اس لیے "یوم القیامۃ" کا ترجمہ "قیامت کا دن" ہی کیا جاتا ہے اور بعض (دفعہ صرف "قیامت" بھی کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ "قیامت" اپنے اصطلاحی معنی کے ساتھ ان الفاظ (مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ کی طرح) میں سے ہے جو قرآن کریم نے عربی زبان کو دیئے۔ اور اسی لیے دنیا کی متعدد اسلامی زبانوں (فارسی، ترکی، اردو، پنجابی سندھی وغیرہ) میں یہ اپنے اصل اصطلاحی معنی کے ساتھ مستعمل ہے۔

● بعض "روشن خیال" حضرات نے "الحیٰوۃ الدنیا" کا ترجمہ "حال کی زندگی" اور "یوم القیامۃ" کا ترجمہ "مستقبل کی زندگی" کی صورت میں کر کے ایک ابہام پیدا کر دیا ہے جس میں بظاہر "انکارِ قیامت" کی "بُو" آتی ہے کیونکہ عام فہم قرآنی و اصطلاحات سے اجتناب یقیناً کسی ذہنی اور فکری خرابی (بلحاظ عقیدہ) کی علامت ہے۔

③ ﴿یُرَدُّوْنَ﴾ اس لفظ کا مادہ (جو یہاں پہلی دفعہ آیا ہے) "ر د د" اور وزن "یُفْعَلُوْن" ہے۔ یہ دراصل "یُرْدَدُوْنَ" تھا۔ پھر پہلی "د" کی حرکت فتحہ (ـَـ) اس کے ماقبل ساکن حرف (س) کو دے کر پہلی "د" کو دوسری "د" میں مدغم کر کے لکھا بولا جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "رَدَّ... یَرُدُّ رَدًّا و مَرَدًّا" (نصر سے) کے بنیادی معنی ہیں "پھیر دینا" یعنی یہ عربی کے فعل "صَرَفَ یَصْرِفُ" کے ہم معنی ہے تاہم بلحاظ استعمال اس کے معانی زیادہ ہیں چنانچہ یہ حسبِ موقع "واپس بھیجنا، واپس کر دینا، واپس لانا، واپس لینا" کے علاوہ "ہٹا دینا، ٹال دینا، روکنا، رد کرنا، نامنظور کرنا، دھکیل دینا" کے معنی بھی دیتا ہے اور بعض دفعہ "لوٹا دینا" بات دہرا دینا اور دوبارہ بنا دینا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بلکہ قرآن کریم میں یہ فعل قریباً مندرجہ بالا تمام معانی کے لیے آیا ہے

● راغب نے "المفردات" میں لکھا ہے کہ اس فعل میں جو "پھیر دینا یا لوٹا دینا" کا مفہوم ہے وہ (رَدّ) دو طرح کا ہوتا ہے' کسی چیز کو بعینہٖ اسی حالت میں پھیر دینا یا واپس لے آنا' جیسے (فرددناہ الی امّہٖ) (القصص: ۱۳) میں ہے "یعنی ہم نے اس کو (موسیٰ کو) اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا"۔ "رد" کی دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں لوٹا دیا (دوبارہ بنا دیا) جائے' جیسے "ثم رددناہ اسفل سافلین" (التین: ۵) میں ہے "یعنی پھر ہم نے اس (انسان) کو پستیوں کی انتہا کی طرف لوٹا دیا / پست ترین بنا دیا"۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے بصورت معروف یا مجہول مختلف صیغے قریباً ۳۶ جگہ آئے ہیں۔ اور مزید فیہ کے باب افتعال اور تفعل کے کچھ صیغے ۹ جگہ آئے ہیں اس کے علاوہ اس مادہ سے ماخوذ و مشتق اسماء اور مصادر (مثلاً رَدٌّ، مَرَدٌّ، مردود وغیرہ) بھی ۱۵ مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "یُرَدُّوْن" فعل مجرد سے مضارع مجہول صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس کا ترجمہ بنتا ہے

وہ سب لوٹائے جائیں گے" جسے بعض نے اصل بنیادی معنی کے ساتھ "پھیرے جاویں گے یا پھیرے جائیں گے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جس کو بامحاورہ کرنے کے لیے "پہنچائے / پہنچا دیئے جائیں گے" "ڈال دیئے جاویں، یا جائیں گے" اور "ڈالے بھی جائیں گے" کی صورت اختیار کی ہے۔ (یہاں ڈالنا "بمعنی دھکیل دینا استعمال ہوا ہے) بعض نے "لوٹا دیئے جائیں گے" ہی رہنے دیا ہے۔

④ "اِلیٰ" کی طرف تک، کئی دفعہ گزر چکا ہے مثلاً دیکھئے [۲:۲۶:۱(۱۰)]

⑤ "اشدّ" (سب سے زیادہ سخت، سخت سے سخت، سخت ترین، بڑا ہی سخت) اس کے مادہ وزن وغیرہ کی وضاحت البقرۃ: ۴۷ [۲:۴۶:۱(۲)] میں ہو چکی ہے۔

⑥ "العذاب" (عذاب اردو میں عام مستعمل ہے) حتیٰ کہ کسی نے اس کا ترجمہ کسی اور لفظ (سزا وغیرہ) سے کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بہرحال اس کی لغوی تشریح البقرہ : ۷ [۲:۶:۱(۶)] میں دیکھ لیجئے۔

● زیر مطالعہ عبارت "ویومَ القیامۃ یُرَدُّوْنَ الیٰ اشدِّ العذاب" کے تمام کلمات (اسماء، حروف اور افعال) کی مندرجہ بالا وضاحت اور تراجم" و معانی کے بیان کے بعد غالباً اب آپ خود اس کا مجموعی ترجمہ کئی طریقوں سے کر سکتے ہیں۔

[وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ] یعنی یہی جملہ اس سے پہلے البقرۃ: ۷۴ [۲:۴۶:۱(۷)] کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ جہاں اس کے تمام اجزاء (کلمات) کی لغوی وضاحت ہوئی تھی۔ اس عبارت کا سادہ لفظی ترجمہ ہے "اور نہیں ہے اللہ بے خبر اس سے جو کچھ کہ تم کرتے ہو"

[اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ] یہ بھی ایک مکمل جملہ ہے جس کے تمام کلمات کی لغوی وضاحت پہلے ہو چکی یہاں ہم ہر ایک کلمہ کے ترجمہ اور لغوی تشریح کے لیے گزشتہ حوالہ دے دیتے ہیں مثلاً

① "اُولٰئِکَ" (وہ سب) کے لیے دیکھئے البقرۃ: ۵ [۲:۴:۱(۱)]

② "الذین" (وہ سب جو کہ) کے لیے دیکھئے الفاتحہ: ۷ [۱:۶:۱(۱)]

③ "اِشْتَرَوْا" (انہوں نے خرید لیا) کے مادہ، فعل مجرد اور اس سے باب افتعال کے اسی صیغہ کی بناوٹ، اس میں ہونے والی تعلیل اور معانی و تراجم البقرۃ: ۱۶ [۲:۱۲:۱(۱)] میں دیکھئے۔

④ "الحیٰوۃ الدنیا" پر مفصل لغوی بحث (ہر دو کلمات کی) ابھی اوپر والی آیت میں [۲:۵۲:۱(۷)] میں کی جا چکی ہے۔

⑤ "بالآخرۃ" (آخرت کے عوض) لفظ "الآخرۃ" کی مکمل لغوی بحث البقرہ:۴ [۲:۳:۱(۵)] میں گزر چکی ہے البتہ وہاں "بالآخرۃ" کی 'با' (ب) فعل "یوقنون" کے صلہ کے طور پر (بمعنی "پر") آئی تھی جبکہ زیر مطالعہ لفظ "بالآخرۃ" کی 'با' (ب) "فعل "اِشتَرَوُا" کے ساتھ (بمعنی "کے عوض") آئی ہے۔ مزید دیکھ لیجئے [۲:۲:۱۱] میں اس کا استعمال۔

● یوں اس عبارت (اُولٰٓئِکَ الذین اشتروا الحیوۃ الدنیا بالآخرۃ) کا لفظی ترجمہ بنا "وہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی دنیوی زندگی آخرت کے عوض" یعنی اپنی آخرت خراب کر لی دنیا کی زندگی (کے فوائد) کے بدلے" یا یوں کہیے کہ "اپنی دنیا بناتے رہے اور آخرت برباد کرتے رہے۔"

۲:۵۲:۱(۹) [فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ] ابتدائی "فَلَا" ("فاء" فصیحۃ اور "لَا" نافیہ (بمعنی "پس نہیں / پھر نہیں) کو چھوڑ کر اگلے صیغہ فعل "یُخَفَّفُ" کا مادہ "خ ف ف" اور وزن "یُفَعَّلُ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "خفّ یخِفّ خِفَّۃً و خَفًّا" (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "ہلکا ہونا" ہیں۔ اس کی ضد "ثَقُل" (وزنی ہونا) ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

"خَفَّ المیزانُ" (ترازو کا کم وزن والا پلڑا اوپر کو اٹھ گیا یعنی (تولی جانے والی چیز کا) وزن کم ثابت ہو گیا) پھر یہ فعل "تیزی سے چلنا، کم ہونا (بارش کا)، کم عقل ہونا، پھرتیلا ہونا، معمولی ہونا اور (رنگ کا) شوخ نہ ہونا یعنی ہلکا ہونا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سے اسم صفت "خفیف" (ہلکا) ہے جو بعض صورتوں میں مدح (اچھی بات) ہوتی ہے اور بعض دفعہ مذمت کا پہلو رکھتا ہے۔ جیسا کہ اوپر دیئے گئے فعل کے مختلف معانی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس فعل کا ایک مصدر "خِفَّۃ" ("خِفّت" کی املاء کے ساتھ) اردو میں "ندامت اور بے عزتی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس میں بھی بنیادی عربی مفہوم (ہلکا ہونا) موجود ہے۔

● قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے ایک ہی صیغہ فعل "خَفَّتْ" (ماضی واحد مؤنث غائب) تین جگہ آیا ہے۔ اور "وزن میں کم ہونا" والے معنی کے لیے ہی آیا ہے۔ اور مزید فیہ کے باب تفعیل اور استفعال سے افعال کے کچھ صیغے گیارہ جگہ آئے ہیں اس کے علاوہ اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق مصدر اور اسم بھی تین جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ "یُخَفَّفُ" اس مادہ سے باب تفعیل کے فعل مضارع مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "خَفَّفَ ... یُخَفِّفُ تخفیفاً" کے معنی "... کو ہلکا کرنا، ... کا بوجھ کم کر دینا" ہوتے ہیں۔ اور یوں یہ فعل "... کی شدت میں کمی کرنا" کے معنی بھی دیتا ہے۔ اس کا مفعول بنفسہ آتا ہے۔

(جو بعض دفعہ غیر مذکور بھی ہوتا ہے) البتہ جس پر سے (بوجہ سزا وغیرہ) کم کی جائے اس پر "عَنْ" کا صلہ آتا ہے۔ قرآن کریم میں اس باب سے فعل ماضی معروف کا صرف ایک صیغہ (خَفَّفَ) صرف ایک جگہ (الانفال: ٦٦) مفعول غیر مذکور کے ساتھ آیا ہے۔ اور مضارع (معروف و مجہول) کے صیغے آٹھ جگہ آئے ہیں۔ "فَلَا يُخَفَّفُ" کا لفظی ترجمہ ہوا "پس ہلکا نہ کیا جائے گا"۔

"عَنْهُمُ" کا ابتدائی "عَنْ" (سے) وہی ہے جس کا اوپر فعل "يُخَفَّفُ" کے ساتھ صلہ کے طور پر استعمال کا ذکر ہوا ہے۔ اس فعل (فلا یخفف) کے ساتھ استعمال کی بنا پر یہاں "عَنْهُمُ" کا ترجمہ "ان پر سے" یا صرف "ان سے" ہوگا۔

• "العَذَابُ" لفظ "عذاب" (بمعنی سزا) اردو میں مستعمل ہے تاہم چاہیں تو اس کی لغوی وضاحت کے لیے دیکھ لیجئے البقرہ: ۷ [۲:۶:۱ (۶)]

[وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ] بعینہٖ یہی جملہ اس سے پہلے البقرہ: ۴۸ [۲:۳۱:۱ (۷)] میں گزر چکا ہے ترجمہ ہے "اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی"۔ ان کلمات کی لغوی تشریح اور مختلف تراجم کی بنیاد سمجھنے کے لیے گزشتہ حوالہ دیکھئے۔

(جاری ہے)

خلیفۂ رابع حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک نہایت مؤثر اور جامع خطاب

مثیلِ عیسیٰؑ --- علیّ مرتضیٰؓ

اب کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات ۵۲' عمدہ طباعت' قیمت (اشاعت عام) -/۷ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶-کے' ماڈل ٹاؤن

قومی ملکیت زمین اور اسلام

تحریر : چوہدری صادق علی مرحوم

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس کے بعد شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرمایا ہے :

"مگر بنا بر آنچہ حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرہ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہد حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مفتوح شدہ بود موقوف برملک بیت المال است و زمینداراں را بیشتر از تولیت و داروغگی تردد و فراہم آوردن مزارعین و اعانت و زراعت و حفظ دخلے نیست۔ چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشارہ باں میکند و تغیر و تبدل زمینداری و عزل و نصب زمینداری و اخراج بعضے از انہا و اقرار بعضے و عطائے بعضے اراضی بافغاناں و بلوچاں و سادات و قدوانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں مے کند..... الخ (فتاویٰ عزیزی جلد اول صفحہ ۴۳ مجتبائی)

(ترجمہ) "شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ جو حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرہ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین ابتدائے فتح میں عراق کی طرح (جو کہ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے اور زمینداروں کو اس کے سوائے کہ وہ اس کے متولی اور داروغہ یعنی منتظم ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش کر کے زمین دینے' زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور و فکر میں رہنے کے اور کوئی حق نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے۔ چنانچہ لفظ زمیندار بھی اسی کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر و تبدل اور عزل و نصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لئے اثبات اور بعض کی داد و دہش مثلاً افغاناں' بلوچ' سادات' مشائخ

وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمین دینا اس دعوے کی صریحاً تائید کرتے ہیں"۔

مندرجہ بالا فتاویٰ جو کہ احناف کے جید علماء یعنی حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری' حضرت مولانا محمد اعلیٰ تھانوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین نے صادر فرمائے ہیں' ان سے صاف واضح ہے کہ پاکستان کی بیشتر اراضی کو حکومت وقت بلامعاوضہ قومی ملکیت قرار دے سکتی ہے اور ایسا کرنا شریعتِ حقّہ کے عین مطابق ہے۔ ہاں البتہ جو اراضیات حکومت نے خود فروخت کی ہوئی ہیں یا جو بنجر اراضیات آبادکاری سکیموں کے تحت لوگوں نے آباد کی ہوئی ہیں' ان اراضیات کو حکومت بغیر معاوضہ ادا کرنے کے نہیں لے سکتی۔ ایسی اراضیات کو بھی معاوضہ ادا کر کے قومی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے۔

زمین قومی ملکیت قرار دینے کے بعد کی صورت

دوسرا سوال یہ ہے کہ قومی ملکیت میں لینے کے بعد زمینوں کی کاشت کا کیا انتظام کیا جائے۔ اس سلسلہ میں بھی حضرت عمر فاروقؓ کا طرز عمل جو انہوں نے عراق کی اراضیات کے متعلق اختیار فرمایا بہترین مثال ہے۔ اسوۂ فاروقی کے مطابق اس وقت جو شخص اراضی کو کاشت کر رہا ہے' خواہ بطور مالک اور خواہ بطور مزارع' وہ زمین اسی کے پاس رہنے دی جائے اور وہ حکومت کا مزارع قرار دیا جائے۔

اس مزارعت میں رقبہ کے متعلق کوئی تحدید نہ لگائی جائے۔ اگر ایک شخص بطور مالک یا مزارع بیس مربع اراضی یا اس سے بھی زیادہ رقبہ ٹریکٹروں وغیرہ سے خود کاشت کر رہا ہے تو وہ بدستور کاشت کرتا رہے اور حکومت کا مقرر کردہ لگان علاوہ معاملہ مال و نہر کے ادا کرے۔ اس طرح زمین پر سے غیر قابض مالکان کا بوجھ اتر جائے گا اور موجودہ صورت میں نہ کوئی مالک رہے گا نہ مزارع۔ سب ایک سطح پر آ جائیں گے اور کاشت کار کہلائیں گے۔ جو کاشت کرے گا وہی کھائے گا اور حکومت کا حق حکومت کو ادا کرے گا۔ اس طرح سے اراضیات کے سلسلہ میں مساواتِ محمدیؐ قائم ہو جائے گی۔ اس پالیسی کو اختیار کرنے سے ملک کی زرعی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو گا اور کاشتکاران یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اراضی کی تمام پیداوار انہی کے گھروں میں جائے گی وہ خوب محنت کریں گے۔ نیز

قابض مالکان کا بوجھ اتر جانے سے وہ خوشحال ہو جائیں گے کیونکہ حکومت کو تو بہت معمولی سا لگان انہیں دینا پڑے گا اور موجودہ صورت میں انکی خون پسینہ کی کمائی کا بیشتر حصہ غیر قابض مالکان بٹائی وغیرہ کی صورت میں ہضم کر لیتے ہیں اور طرح طرح کی بیگاروں سے بھی نجات کی صورت نکل آئے گی۔ موجودہ صورت میں تو بیچارے مزارعان کو بڑے اور چھوٹے تمام مالکان کے ظلم و ستم سہنے پڑتے ہیں۔

بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں سب ختم ہو جائیں گی اور بڑے بڑے زمیندار صرف خود کاشتہ رقبہ ہی اپنے پاس رکھ سکیں گے اور وہ بھی حکومت کے مزارع کے طور پر نہ کہ بطور مالک۔ جو خود کاشت نہیں کر رہے' خواہ وہ بڑے مالک ہیں یا چھوٹے' زمین کی آمدنی میں سے ایک کوڑی نہیں لے سکیں گے۔ یہ بڑے زمیندار بھی خود کاشتہ رقبہ پر پہلے سے زیادہ محنت کر سکیں گے کیونکہ دوسری اراضیات کی جو وہ مزارعان سے بٹائی وغیرہ لے رہے تھے' ختم ہو جائے گی اور وہ بھی کاشت کاروں کے زمرہ میں داخل ہو جائیں گے اور دوسروں کی طرح ان کو بھی حکومت کا لگان دینا پڑے گا۔ اب سب کی پوزیشن مساوی ہوگی' اور اس طرح مساواتِ محمدی صحیح معنوں میں وجود میں آئے گی۔

ع نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز!

اسلام میں کاشتکار کا لحاظ اور لگان کی شرح

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کاشتکاروں سے کس شرح سے لگان وصول کرے گی۔ اس معاملہ میں بھی ہمیں سنتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو مشعل راہ بنانا چاہئے۔ حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم نے لگان یا خراج وصول کرنے میں یہ چیز ملحوظ رکھی تھی کہ کاشتکاروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے اور ہر حالت میں حکومت کے مفاد سے زیادہ کاشتکار کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا تھا۔ اسی طرح حکومت پاکستان کو بھی کاشتکاروں کی خوش حالی کی خاطر بہت کم شرح لگان مقرر کرنی چاہئے۔ حضرت امام یوسفؒ کتاب الخراج میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے خراج کے تقرر میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کو پیش نظر رکھنے کی تنبیہ فرمائی تھی اور ارشاد فرمایا تھا :

انظر الا تکونا حملتما الارض مالا تطیق' اما لئن بقیتُ لأرامل اھل العراق لادعھن لا یحتجن الی احد بعدی (کتاب الخراج صفحہ ۷۳۔ بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام' ص ۱۸۰)

"خراج مقرر کرتے وقت خوب دیکھ بھال کر لیا کرو کہ کہیں لگان زمین کی حیثیت سے زیادہ تو نہیں ہو گیا۔ اگر میں زندہ رہا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا متمول کر دوں گا کہ میرے بعد وہ کسی امیر کی محتاج نہ رہیں"۔

اس کتاب میں امام ابو یوسفؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج وصول ہو کر آتا تو عراق کے متمدن شہروں کوفہ اور بصرہ سے دس دس آدمیوں کے وفد بلاتے اور وہ چار مرتبہ قسمیں کھا کر شہادت دیتے کہ ہم سے جو کچھ وصول کیا گیا ہے بغیر کسی ظلم کے برضا و رغبت وصول کیا گیا ہے' اس میں نہ تو کسی مسلمان پر ظلم کیا گیا ہے اور نہ کسی ذمی کافر پر۔ پھر امام صاحب رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

ثم تکون المقاسمات فی اثمار ذلک او یقوم ذلک قیمۃ عادلۃ لا یکون فیھا حمل علی اھل الخراج ولا یکون علی السلطان ضرر ثم یُؤخَذُ منھم ما یلزمھم من ذلک' ای ذلک کان اخفّ علی اھل الخراج فعل ذلک بھم (کتاب الخراج' صفحہ ۱۱۴)

ترجمہ : "پھر ان پھلوں کو بانٹ لیا جائے یا ان کی قیمت انصاف کے ساتھ اس طرح لگائی جائے کہ وہ اہل خراج پر بوجھ نہ ہو اور نہ حکومت ہی کو نقصان پہنچے۔ پھر ان کے ذمہ اس طرح جو لازم آئے وہ ان سے لے لیا جائے۔ مگر یہ پیش نظر رہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہی اختیار کی جائے جو اہل خراج کے لئے سہل اور آسان ہو"۔

لگان میں رفق و تسکین

کاشتکاروں سے خراج اور لگان وصول کرنے کے لئے جو اصول امام موصوف نے بیان فرمائے ہیں' ان کی روح مندرجہ ذیل لفظوں میں بیان کی ہے :

فخذہ فی رفق وتسکین لاھل الارض (کتاب الخراج ص ۸۳)

"اور تم خراج اس طرح لو کہ اہل زمین یعنی کاشت کار کو اس کے ادا کرنے میں نرمی اور تسکین رہے"۔

سبحان اللہ! امام صاحبؒ نے کاشتکار کو اہل زمین کا خطاب دیا ہے یعنی زمین دراصل اسی کی ہے۔

قرآن اور سنت کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام ایک ایسا عادلانہ نظام معاشرہ میں لانا چاہتا ہے جس میں سوسائٹی کے پس ماندہ طبقہ یعنی کسان اور مزدور کے ساتھ رفق اور تسکین کا معاملہ کیا جائے تاکہ معاشرہ کا کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور سب کے لئے حق معیشت میں مساوات ہو' اگرچہ اسبابِ معیشت میں فطری تفاوت کو روا رکھا جائے۔ اسلام کا اقتصادی نظام عوام کی خوشحالی کا مقتضی ہے اور پاکستان کی اسّی فیصد آبادی جو زراعت سے وابستہ ہے اس کی خوشحالی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اراضی کی تمام پیداوار کا انہیں مستحق بنا دیا جائے اور وہ صرف معمولی لگان حکومت کو ادا کریں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے الفاظ میں رفق اور تسکینِ کاشتکاران کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے۔ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اس رفق و تسکین کا عملی طور پر یوں انتظام کیا گیا تھا کہ کسانوں سے لگان کی شرح بہت ہی معمولی تھی۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں عراق کی اراضیات پر حضرت فاروق اعظمؓ کا مقرر کردہ لگان درج کیا جاتا ہے۔

فصل	رقبہ	لگان فی جریب (۳ کنال)	
گندم	فی جریب یعنی پون بیگھہ پختہ	(۳ کنال)	۲ درہم
جو	"		۱ "
نیشکر	"		۶ "
روئی	"		۵ "
انگور	"		۱۰ "
کھجور	"		۱۰ "
تل	"		۸ "
ترکاری	"		۳ "

بعض اراضیات جو بہت زرخیز تھیں اور زیادہ پیداوار دیتی تھیں' ان پر گندم کا لگان

دو درہم کی بجائے چار درہم لگایا گیا تھا اور جو کا ایک درہم کی بجائے فی جریب دو درہم لگان مقرر کیا گیا تھا۔ مصر کی اراضی دریائے نیل کی وجہ سے زیادہ زرخیز تھی لہٰذا وہاں قدرے لگان بھی زیادہ مقرر کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لگان باغات کا تھا جو کہ سات آٹھ روپے فی ایکڑ سے زیادہ نہ تھا۔ ہماری حکومت کو بھی فاروق اعظمؓ کے نقش قدم پر عمل پیرا ہو کر اراضی کو قومیانے کے بعد کسانوں کے ساتھ رفق اور تسکین کا برتاؤ کرتے ہوئے قریباً اسی شرح سے لگان مقرر کرنا چاہئے۔ فقہانے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جب امام کسی زمین پر ابتدائی طور پر لگان مقرر کرنا چاہے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حضرت عمرؓ کی شرح لگان سے زیادہ لگان تجویز کرنا ناجائز ہے' کیونکہ اہل خراج کے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود حضرت عمرؓ نے خراج نہیں بڑھایا تھا۔ فقہ کی مشہور کتاب بحرالرائق کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں :

واما اذا اراد الامام توظیف الخرج علی ارض ابتداءً و زاد علی وظیفة عمرؓ فانه لایجوز عند ابی حنیفهؒ وهو الصحیح لان عمر رضی الله عنه لم یزد لما اُخبِرَ بزیادة الطاقة (بحرالرائق' ص ۱۱۷)

"جب امام کسی اراضی پر ابتداءً لگان تجویز کرنے کا ارادہ کرے تو امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مقدار سے زیادہ لگان مقرر کرنا ناجائز نہیں ہے اور یہی صحیح فتویٰ ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اطلاع دی گئی تھی کہ اہل خراج زیادہ ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں' پھر بھی انہوں نے خراج کو نہیں بڑھایا تھا"۔

مندرجہ بالا فتوے کی روشنی میں ہماری حکومت کو کسانوں سے قریباً اسی شرح پر لگان لینا چاہئے جس شرح سے حضرت فاروقؓ لیا کرتے تھے۔ اراضیات کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے ہاں لگان کی شرح پانچ روپے سے پندرہ روپے فی ایکڑ سالانہ مقرر کرنی مناسب ہے۔

برابر بھی لگان مقرر کردیں تو کسان اسے بخوشی قبول کرلیں گے' جیساکہ تقسیم ملک کے فوراً بعد مہاجرین سے عارضی طور پر الاٹ شدہ متروکہ اراضیات کا لگان وصول کیا جاتا رہا ہے۔

مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کرنے سے ہمارے کسان خوش حال ہو جائیں گے اور برسرِ اقتدار پارٹی یعنی پیپلزپارٹی کا مقصد[1] بھی پورا ہو جائے گا اور غریب عوام ان کو دعائیں دیں گے۔ ان شاء اللہ علمائے کرام بھی ان تجاویز کی مخالفت نہیں کریں گے کیونکہ یہ اقدامات شریعتِ مطہرہ کے عین مطابق ہوں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت کے خزانہ میں کروڑوں بلکہ اربوں روپوں کا سالانہ اضافہ ہوگا اور یہ رقوم جہاد پر اور عوام کی فلاح پر خرچ کی جاسکیں گی۔ جو اراضیات حکومت نے لوگوں کے پاس فروخت کی ہوئی ہیں یا جو اراضیات مختلف آبادکاری سکیموں کے ماتحت لوگوں نے آباد کر رکھی ہیں ان کا معاوضہ بھی اسی زائد وصول شدہ رقوم سے ادا کیا جاسکتا ہے کہ بالآخر تمام اراضی قومی ملکیت میں لے لی جائے اور تمام ملک میں ایک ہی پالیسی پر عمل کیا جائے۔

تحدیدِ ملکیت سے کسانوں کے لئے ہمہ گیر فوائد حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ بڑے زمینداروں کی تعداد اس ملک میں زیادہ نہیں ہے۔ اور پھر تحدید کی صورت میں وہ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام معقول اراضی منتقل کرکے بہت کم اراضی حکومت کے حوالے کریں گے اور اس کی بھی غالباً قیمت مزارعان کو ادا کرنی پڑے گی۔ اس وقت تمام غیر قابض مالکان خواہ وہ چھوٹے ہیں یا بڑے' کسانوں کا خون چوس رہے ہیں۔ تمام کسانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ انہیں سب سے نجات دلاکر اراضی کی تمام پیداوار کا مستحق بنایا جائے۔ اس

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر اس دور کی ہے جب پیپلزپارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں ملک کی زمام کار سنبھالی تھی۔ بھٹو مرحوم چونکہ ملک سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے اور "مساوات محمدی" کے نفاذ کا نعرہ لگاکر برسراقتدار آئے تھے لہٰذا اس وقت ان سے ملک کی زرعی معیشت میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں کی توقع کی جارہی تھی---- لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! بھٹو صاحب کے بارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بجا طور پر فرمایا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موقع فراہم کیا تھا کہ وہ اس ملک کے "ماؤزے تنگ" بن سکتے تھے لیکن وہ خود اپنی جاگیردارانہ کھلڑی سے باہر نہ نکل سکے۔ (ادارہ)

صورت میں وہ خوشی سے حکومت کو مناسب لگان ادا کریں گے۔ یہ لگان تین گنا معاملہ مال سے زائد نہ ہو۔ جب شرعی طور پر بیشتر اراضی کو بلا معاوضہ قومی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے تو ہماری حکومت کو کونسا عذر ایسا کرنے سے مانع ہے۔ عوام بھی خوش ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی ان سے راضی ہو گا۔ غیر شرعی نظام کے نفاذ سے اللہ تعالیٰ بھی ہم سے ناراض ہو گا اور بیچارے کسانوں کو اقتصادی حالت میں بھی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئے گی۔

اخیر میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حکومت سعی کرے کہ مشینی آلات سے ترقی یافتہ زرعی طریقوں کو رائج کیا جائے تا کہ ملک کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ اس غرض کے لئے کوآپریٹو فارمنگ سوسائٹی ہائے قائم کی جائیں اور اس طرح سے چھوٹے چھوٹے رقبہ جات کو بڑے فارموں میں ضم کیا جائے۔ اس وقت تقریباً دس فی صدی رقبہ کی پیداوار مویشی کھا جاتے ہیں۔ مشینوں کی کاشت سے غلہ پیدا کرنے کے لئے رقبہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ ہاں البتہ بڑے بڑے فارم قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ملک میں صنعت کو ترقی دی جائے تا کہ جو کسان فارموں کے قیام کی وجہ سے بے کار ہوں انہیں روزگار مہیا کیا جا سکے۔ حکومت کی پالیسی یہی ہو کہ زمین کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے بچا جائے تا کہ ہماری ملکی پیداوار پر برا اثر نہ پڑے۔ کام بے شک مشکل اور کٹھن ہے مگر ملک اور قوم کا فائدہ اسی میں ہے۔

امید ہے کہ علمائے کرام اور ہمارے منتخب نمائندگان میری گزارشات پر توجہ دے کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

وَمَا عَلَيْنَا الا البَلاغ

site of Al-Aqsa mosque. It seems likely that the Jews would try to orchestrate another war between the West, especially the United States, and the Arab Muslims, most probably on the pretext of dealing with the threat of Islamic Fundamentalism.

Along with their sinister plan to gain control over the whole world through financial institutions – much of which has already been achieved – the Jews are also waiting for their Promised Messiah who would help them recapture the glory of David and Solomon. The Messiah was, in fact, none other than Prophet Jesus (Peace be upon him), but they opposed and rejected him, and tried their very best to have him crucified, though he was miraculously saved by Almighty God.

During the long series of imminent battles in the Middle East, Dajjal the individual would come forward - who is probably going to be an orthodox and fundamentalist Jew, claiming to be the Promised Messiah – and would lead them to the de facto creation of Greater Israel (which is supposes to include parts of Egypt, whole of Jordan and Syria, major portions of Iraq, southern Turkey, and northern Hijaz up to the holy city of Medina). Then God the Almighty will send the real Christ, with the mission of exterminating the Jews and their leader, Dajjal, the false prophet.

To be continued

TO CHRISTIANS WITH LOVE

Based on the lectures delivered by

Dr. Israr Ahmad

Price Rs. 8.00

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore

aristocracy. The masses are encouraged to work hard, to enjoy their weekends, to digest whatever the media feeds them, and to invest all their time and energy in raising their standards of living. Endless consumption of products has become the dominant life-style of our times, and people have been made conditioned to measure each other on the basis of wealth and affluence, rather than character and morals. A whole entertainment industry has been created to keep the minds of the masses occupied whenever they are not working.

The entire system is acting as a contemporary "opium of the masses", so that no one can have either the time or the energy to give any serious thought to the nature of existence, about his Creator, about the accountability in the Hereafter – or about the exploiters. Dajjal the individual will represent the interests of those who are financially exploiting the whole world, against those who are being exploited. After the Armageddon, a Just Social Order will replace the present "Dajjalian System", and there shall be no more exploitation.

The Identity of Dajjal

The ultimate battle between the forces of Good and those of Evil requires a world that is highly polarized along ideological lines, and this has already started to take shape. The various Islamic movements throughout the world are clear proofs that more and more people are realizing the defects of the "Dajjalian System", and are coming in contact with the true sources of knowledge, that is, the Holy Qur'an and the Sunnah of Prophet Muhammad (Peace be upon him). The guardians of the status quo and the defenders of the New World Order, along with their agents and stooges, have already smelled the revolution that is taking shape in the form of Islamic Resurgence, and have started to try and suppress the idea whose time has come. The futility of their efforts is obvious.

The Western and predominantly Christian countries of the world, as we have discussed before, are virtually being controlled by a powerful Jewish lobby – aided by the extensive intelligent network of Israel – a recent accomplishment of which was the destruction of the military might of Iraq in the Gulf War. The next step in the Jewish agenda is the creation of Greater Israel, as well as the reconstruction of Solomon's Temple at the

mistrust of all thing connected with religion. The ruthlessly unfavorable attitude of the clergy caused a reactionary feeling of hatred against the Church, and then against the very idea of religion itself.

The development of science and philosophy in Europe, therefore, was forced to take place in an environment hostile to religion, and this hostility has since then permeated deep down into the very roots of Western thought. The world-view and civilization that grew out of this materialistic frame of mind is what we call the "Dajjalian System" of life. The hallmark of this system is a profound shift of emphasis – from God the Almighty to the material universe and laws of nature, from spiritual pursuits to sensual gratification, and from salvation in the life-after-death to success and prosperity in this world.

Human beings have been endowed by Allah (SWT) with two distinct sources of knowledge, that is, (a) information gathered by the senses and their interpretation by means of reason, intellect, and logic; along with (b) Revelation, in order to acquire metaphysical knowledge and practical guidance. However, the unfortunate shift of emphasis mentioned above resulted in a serious lack of balance in the modern thinking process. Thus, while humanity has made an incredible amount of progress with regard to science and technology, we see that, simultaneously, religion and morality have undergone an unprecedented decay. As such, the Western civilization can be described as possessing only a single eye. In other words, it has invested everything it had into a single source of knowledge – Reason and Science – while totally ignoring the other, equally important, source of knowledge which is Revelation from God the Almighty.

The system of life resulting from this materialistic mental attitude is characterized by a morbid preoccupation with collecting things and accumulating money. The corner stone of the "Dajjalian System" is the producer-consumer process, which is promoted as the ideal way of life. Highly sophisticated means are employed to convince the masses that they want newer and more expensive products, so that they can be made to work continuously in order to earn money to buy the goods they don't even need. The life blood of the "Dajjalian System" is usury, which is used to subjugate individuals as well as entire nations, so that they can be controlled and manipulated by a financial

word Armageddon has now come to mean the final battle between the forces of Good and the forces of Evil.

Dajjalian System of Life

It is important to distinguish between Dajjal the individual, and Dajjal as a world-wide intellectual and social phenomenon based on materialism and atheism. The latter is manifested as the philosophical outlook that has taken shape during the last few centuries in Europe, as well as the culture and life-style based upon that outlook. The system of life which is predominantly materialistic and which dominates the entire globe today is actually the "Dajjalian System" itself, whereas the greatest defender of that system is going to be Dajjal the individual.

As we have already seen, the innovations introduced by St. Paul in the original teachings of Jesus Christ had led to the genesis of a completely new and different religion. The highly irrational claim of Trinity ultimately resulted in the divorce between two natural allies, religion and reason. The conversion of Caesar Constantine in 313 CE, and of the entire Roman Empire during the next hundred years or so, turned out to be the starting point for the establishment of Christian Theocracy in Europe. The huge vacuum created by the Pauline idea of abolition of the Mosaic law was then filled with the virtually unlimited authority of the Church, represented by the infallible Pope. During the Middle Ages the Church and the clergy ruled the masses with an iron hand, oppressing and exploiting them in the name of religion, while discouraging any inclination towards science or rationalism.

The Aristotelian system of cosmos, as adopted by Ptolemy, was already incorporated into the Christian theology. As a result, when Copernicus, Kepler, and Galileo opposed the Geocentric doctrine and proposed Heliocentric views based on their scientific observations, the Church condemned and vehemently opposed them as heretics, starting the unfortunate rivalry between Science and Religion.

The scientific and rationalistic movement in Europe, therefore, came face to face with the powerful religious establishment of the Church. The latter used all its resources to halt this new wave of progress towards knowledge and learning, but succeeded only in producing among the masses a deep

the world for the battle on the great day of God the sovereign Lord. (16:13,14)

...I saw a woman mounted on a scarlet beast which was covered with blasphemous names and had seven heads and ten horns... I saw that the woman was drunk with the blood of God's people, and with the blood of those who had borne their testimony to Jesus... the angel said... the beast you saw was once alive, and it is alive no longer, but has yet to ascend out of the abyss before going to be destroyed. (17:3,6-8)

I saw heaven wide open, and a white horse appeared; its rider's name was Faithful and True, for he is just in judgment and just in war... The armies of heaven followed him... Out of his mouth came a sharp sword to smite the nation; for it is he who will rule them with a rod of iron... I saw the beast and the kings of the earth with their armies mustered to do battle against the rider and his army. The beast was taken prisoner, along with the false prophet who has worked miracles in its presence and deluded those who had received the mark of the beast and worshipped its image. The two of them were thrown alive into the lake of fire with its sulfurous flames. The rest were killed by the sword which came out of the rider's mouth, and the birds all gorged themselves on their flesh (19:11,14,15,19-21)

I saw an angel coming down from heaven with the key to the abyss and a great chain in his hand. He seized the dragon, that ancient serpent who is the Devil, or Satan, and chained him up for a thousand years; he threw him into the abyss, shutting and sealing it over him, so that he might not seduce the nations again till the thousand years were ended. After that he must be let loose for a little while. (20:1-3)

The site of the final battle against the Anti-Christ is said to be Armageddon (Revelation 16:16), located in the ancient stronghold of Megiddo, roughly 15 miles south-east of Haifa, Israel. The

reorganize and unite the Muslim forces against the Christians, shifting the fortunes of The War in the favor of Muslims.

The third phase of The War will commence with the appearance on the scene of an exceedingly cunning Jewish leader – Dajjal or Anti-Christ. From then onwards the Jews will start to take active part in the fighting, and the combined forces of Jews and Christians will inflict heavy losses on the Muslims. At this stage – Prophet Muhammad (Peace be upon him) has told in clear words – Prophet Jesus Christ will reappear and reinforce the Muslim armies. He will deliver the final installment of Divine punishment to the Jews, and will kill their leader, Dajjal. The reappearance of Jesus Christ (Peace be upon him) shall mark the end of Christianity as a separate religion, and the most glorious and most peaceful era of human history will commence. This will be "God's Kingdom on earth", when the Deen of Allah (SWT) will reign supreme, and the world will enjoy unprecedented bounties and blessings of the Lord.

This period of Khilafah on the pattern of Prophethood will last so long as God wills; then, after this blissful era, the world will once again be filled with wickedness. All the faithful population of the world shall die peacefully and calmly one day, just before the end of the world. In this way, only the unbelievers and the wicked shall be left to face the dreadful events of the Doomsday.

Armageddon!

It is interesting to note that prophecies regarding an ultimate World War between the forces of Good and the forces of Evil are also found in the Christian tradition. The highly cryptic and symbolic language of the last book in the New Testament – the Revelations of John – is often difficult to interpret, but the references to the beast and the false prophet resembles closely the Muslim concept of Dajjal; the woman riding the beast most probably refers to the Jews and their revival; the rider coming on the white horse seems like representing the Second Coming of Prophet Jesus Christ. Here are a few excerpts:

> I saw three foul spirits like frogs coming from the mouths of the dragon, the beast, and the false prophet. These are demonic spirits with power to work out miracles, sent out to muster all the kings of

be no house on the entire earth – neither of bricks nor one made of camel's skin – but God will cause the word of Islam to enter it, either with the honor of the one who deserves honor, or with the subjugation of the one who is defeated. That is to say, God will confer honor on some and they will embrace Islam, and He will cause the others to give up fighting and they will surrender before the rule of Islam."

The way to God's Kingdom

Belief in the inescapable event of Doomsday is part of our faith as Muslims, and, in this context, the global happenings of our age clearly indicate that the end of the world is probably a matter of near future. This opinion is based upon the predictions of Prophet Muhammad (Peace be upon him), many of which have already came true in the world around us, and the stage is obviously being set for the final set of events before Doomsday – the grand finale of the global drama. We shall now discuss these coming events, which will precede the establishment of the domination of Islam, as disclosed by Prophet Muhammad (Peace be upon him).

Indications regarding the greatest World War that appear in the Hadith collections are, in general couched in allegorical language. It seems that The War will take place in three phases, and will be fought predominantly in the Middle East. During the first phase, Muslim and Christian armies will unite and fight against a third force, the identity of which is uncertain. The allies will defeat their common enemy, but then serious discord and hostility will break out between them, leading to the second phase of The War characterized by fierce fighting between the Muslim and Christian armies. Initially the Christians will have the upper hand, and the Muslims will lose important strongholds like Turkey, Lebanon, Syria, and Iraq. Although during the first and second phases the Jews themselves won't take part in the battle, their resources, technical know-how, and their propaganda machinery will be used with utmost destructive effect against the Muslims.

At this point, according to the prophecies, the Muslims will select a rightly guided man as their military and political leader. This leader, called Mahdi in the Hadith literature, will

passing through the the finall stage of its evolution. The Divine current of consciousness is still active in the collective mind of humanity, urging and guiding us towards the ultimate state of human perfection, i.e., towards the establishment of the global culture-civilization that will be based upon the teachings of the Qur'an. In this way the philosophy of Ideals, as developed by Dr. Muhammad Rafiuddin, makes it even more understandable how the global domination of Islam before the end of the world is inevitable from an evolutionary stand point.

This global domination of Islam has been clearly predicted in the sayings of Prophet Muhammad (Peace be upon him), three of which are quoted below:

> (1) According to a tradition that is narrated by Imam Ahmad on the authority of Nauman Ibn Bashir, Prophet Muhammad (Peace be upon him) is reported to have said to his companions, "The period of Prophethood will remain among you so long as God wills, then He shall cause it to end. After that, there will be Khilafah among you on the pattern of Prophethood, and this will last as long as God wills, and then He shall cause it to end. After that, there will be a reign of oppressive monarchy, and this will also last as long as God wills, and then He shall cause it to end. After that there will be a period of enslavement, and this will last as long as God wills, then He shall cause it to end. Finally, there will again be Khilafah on the pattern of Prophethood."
>
> (2) In another tradition narrated by Imam Muslim on the authority of Thauban, the Messenger of God (Peace be upon him) is reported to have said, "God the Almighty folded up the whole earth for me (in a vision), so that I was able to see all the easts and all the wests, and surely the domination of my followers will be established over all those places that were shown to me by thus folding the earth."
>
> (3) Imam Ahmad has narrated, on the authority of Miqdad Ibn Aswad, that the Prophet of God (Peace be upon him) is reported to have said, "There shall

The existence, as the Holy Qur'an proclaims again and again, is something profoundly meaningful. The evolution of the universe in the direction of a predetermined goal is what provides everything with a single grand purpose. The universe is continuously in a process of evolution, constantly working to perfect itself.

According to Dr. Muhammad Rafiuddin (whose philosophy of history was mentioned earlier in this book), the cause of the evolution of cosmos is the desire or the will of the Creator. This desire or will of Allah (SWT) is flowing in the universe as a current of consciousness, changing the universe with a view to bringing it to the stage of its highest perfection. This cosmic evolution can be described as happening in several stages, as follows:

The first stage was that of physical evolution, from the Big Bang up to the time when simple chemical compounds grew into complex organic molecules, leading to the emergence of life on earth. This stage of purely physical change was directed by the Divine current of consciousness that continuously runs through all matter, causing it to behave in specific ways.

The second stage was that of biological evolution, when the same current of consciousness took the form of an indwelling life-force (compare Bergson's *élan vital*), which directed the process towards the creation of the perfect animal, man. It has been theorized on the basis of the pointers in the Holy Qur'an that, at this stage, Allah (SWT) selected a single pair of these human-animals, and endowed them with their spiritual souls; this was the creation of Adam and Eve.

The third stage was that of intellectual evolution, when the current of consciousness took the form of an urge for Beauty and Perfection, expressing itself in the love of an ideal (compare Freud's Libido), guiding the process towards the climax of intellectual and psychological development, that was finally achieved in the personality of Prophet Abraham (Peace be upon him).

The fourth stage was that of the collective cultural and social evolution of humanity, reaching its zenith in the life and teachings of Prophet Muhammad (Peace be upon him), when the true way of life or *Deen-ul-Huq* was perfected and the ideal system of social, economic, and political Justice was presented to the mankind in its final form. At the moment, the mankind is

by the New World Order.

Under the existing state of affairs, which is both distressing and disheartening, we must keep on reminding ourselves that the ascendancy of Islam over the entire globe is bound to come, as this has been emphatically foretold by none other than the Last Messenger of God himself, may God's peace and mercy be upon him. Although there is no such explicit and unequivocal guarantee in the Holy Qur'an, we find that both the minor and major premises of this syllogism are repeatedly mentioned, the inescapable conclusion of which is the ultimate establishment of world-wide supremacy of Islam. The major premise consists of the fact that Prophet Muhammad (Peace be upon him) was appointed a messenger and envoy of God the Almighty for the whole humanity (Al-Qur'an 7:158; 21:107; 25:1; 34:28; & 62:2,3), whereas the minor premise is represented by the Divine assertion that the true way of life or Deen-ul-Haq will be made superior over the entire system of living (9:33; 48:24; & 61:9), and that God the Almighty is going to perfect His Light despite all the resistance from the unbelievers (9:32 & 61:8). The logical conclusion that necessarily follows from these premises is that the real purpose and the ultimate aim of the advent of Prophet Muhammad (Peace be upon him) will be fulfilled only with the establishment of the ascendancy of Islam over the entire mankind, all over the world. This has been promised by Almighty God in these words:

> God has promised that He will surely make those of you who believe and do the right, vicegerents in the land, as He had made those before them, and He will surely establish their faith which He has chosen for them, and He will surely change their state of fear into peace and security. (24:55)

The Ascent of Humanity

In sharp contrast to all the materialistic theories of modern Science, the Holy Qur'an teaches us that Allah (SWT) is the only real force behind every creative activity that takes place in the universe. The clear and obvious signs of purpose and direction in the cosmos indicates that there is an intelligent mind at work, as pure chance could only have produced total chaos.

The Big Crunch will be followed by another Big Bang, leading to the creation of a new universe that will last forever, and which will be totally different from our present universe, utterly beyond the realm of our imagination. We believe, on the authority of the Qur'an and Prophet Muhammad (Peace be upon him), in the rebirth of all humanity, their final judgment, the Hell and the Paradise, though the exact nature of that state of existence is simply inconceivable.

As far as the end of our own world is concerned, it seems that a major catastrophe will befall, destroying a part of our galaxy including the sun and the earth, and that this will happen well before the universal doomsday or the Big Crunch. It is this local doomsday that is referred to in the Holy Qur'an as the "Startling Calamity" or the "Inevitable".

The Ascendancy of Islam

There are a few cryptic remarks in the Holy Qur'an regarding the events which will precede the doomsday; these points are fully explained in the form of detailed prophecies that appear in the traditions of Prophet Muhammad (Peace be upon him). According to these prophecies four major events will happen before the end of the world; in chronological sequence, they are as follows:

(1) The Ultimate World War of the human history, which will be fought predominantly in the Middle East;
(2) The appearance of Anti-Christ, or Dajjal, in the final phase of that war, a leader who will inflict huge sufferings and destruction over the Arab Muslims;
(3) The reappearance of Jesus Christ (Peace be upon him), who will cause the extermination of Dajjal and his Jewish followers; and finally,
(4) The establishment of the system of Khilafah, or the domination of Islam, over the entire globe.

Except for the reappearance of Jesus Christ, there is nothing supernatural or incredible in these prophecies, as we shall discuss shortly. The very idea of the global domination of Islam however, seems like a fool's fantasy, keeping in view the present state of humiliation of the Muslims and their virtual enslavement

the Jews were able to take control of the affairs of the world without really exposing or endangering themselves.

This unnatural and artificial alliance between the Jews and the Christians – the basis of the so-called New World Order – is actually nothing more than the relationship between a parasite and its host, or between a master and his slave. One of the recent manifestations of this bizzare friendship is the decree issued by the Pope, exonerating the Jews from the two-thousand years old charge of crucifying Jesus Christ. The Holy Qur'an had prophetically warned us of the dangers of this coalition thus:

> O Believers, do not hold Jews and Christians as your allies. They are allies of one another; and anyone who makes them his friends is surely one of them; and God does not guide the unjust. (5:51)

Before the Doomsday

It is an essential part of our faith as Muslims that we take the universe in which we live as created and contingent and not eternal. Unlike the early Greeks, who thought that the universe had always existed, the Holy Qur'an teaches us that ours is a very large but finite universe in terms of both space and time, and as such it has a definite beginning and a certain end.

In the beginning, God created a concentrated core of light-energy, and then, later on, He caused it to explode in a Big Bang, leading to the creation of time, space, and matter. This phenomenon of creation out of nothing represents the manifestation of divine command "Be!" The Big Bang did not happen at any specific place, as the "space" itself was created with this explosion. Similarly, it did not occur at any particular instant, as the "time" itself came into being with the Big Bang.

Since then, the universe has been continuously expanding, rotating, and evolving. At a predetermined point in the future, it will stop expanding, and from then on the contraction or folding-back phase of the universe will commence – either due to the gravitational pull of the unseen matter exceeding the forces of expansion, or as a result of the swallowing up of entire galaxies by Black Holes – leading ultimately to the Big Crunch, which is the disappearance of the cosmos in a catastrophic implosion, like the Big Bang in reverse.

acrimony – the present state of alliance and friendship between them and the Christians,

The persecuted Jews were well aware that the only way to turn the table on their arch enemy, the Christians, was by way of minimizing the influence of religion over them and by debilitating the authority of the Church. Thus, they ingeniously used the spirit of rationalism – that was already spreading form Muslim Spain into Christian Europe to make a breach in the bastion of Christian faith. As a matter of fact, the highly irrational and alomost ridiculously illogical dogmas being enforced by the Church in the name of religion were never in a position to stand against the tide of Reason. The Renaissance in Europe was characterized by an intense interest in the physical world and in the knowledge derived from concrete sensory experience, and a decline in metaphysical speculations and interest in the life after death – both of which were prominent themes during the Middle Ages. This rise of Reason, therefore, turned out to be the beginning of the end for Christianity, and the onset of the domination of materialism and pragmatic morality. The European Jews – by playing a key role in polluting the essence of rationalism with the evils of licentiousness and promiscuity, as well as with that of intellectual vagrancy which is euphemistically called "liberalism" – were able to increase their influence in the Christian society. The rise of sexual permissiveness and the resulting breakdown of traditional family values in the West represents only one aspect of the defeat of Christian morality against the financial interests and the growing influence of the Jews.

At the same time, the rise of Protestantism and the movement for "Reformation" opened the gates of unlimited individual freedom and destroyed the unity of Christiandom. Although usurious money-lending activity of the Jews had existed on a small scale throughout the middle Ages, the weakening of the Church, along with the liberal views of John Calvin (1509-1594) in Economics, ultimately led to an enormous rise in the previously prohibited practice of usury. The acceptance by the Christians that such transactions are unavoidable for economic growth and material prosperity made them willing hostages of the money-lending institutions – banks, insurance companies, and the like – all of which are strongholds of the Jewish people. Today these financial institutions are the uncontested rulers of the Western World, particularly of Britian and the United States. This is how

Jewish historians like Abba Eban and Solomon Grayzel have acknowledged and recognized their "Golden Age of Diaspora" – the period of Jewish affluence and growth in Muslim Spain. When the Arab rule came to end in 1492, and the Jews were immediately expelled from Spain by the Christian rulers Ferdinand and Isabella, they were given refuge and asylum in the Ottoman Empire. Large population of Jews continued to prosper peacefully in Iraq, Syria, Yemen, and Egypt, during the time when their brethren were suffering heavily in Europe, particularly in the Russian Lands.

According to the Holy Qur'an, the hatred and enmity between the Jews and the Christians will last till the end of the world (5:14 & 64). However, we can clearly see that their mutual rancor had underwent a very slow and gradual decline, during the last few hundred years. The Qur'an seems to be saying, therefore, that the present coalition between the Jews and the Christians is only superficial and cosmetic as well as transient, and also that the end of the world is not very far.

We know that the Jews had always viewed themselves as a special breed of people, superior to the rest of the humity as the "Chosen People of the Lord", who are born to rule the Gentiles. As a result, they couldn't believe their centuries of shockingly unexpected humiliation, and thus the episodes of Divine retribution – instead of softening their hearts and producing in them a desire to repent and the willingness to atone for their collective crimes – has produced in them a revengeful and malicious envy and a sort of diabolical biterness.

It would of course be unfair to make sweeping generalizations, because individual characters very greatly, but as far as the collective psyche of the Jewish nation is concerned, it is undeniable that they have developed a deeply ingrained tendency to conspire and to maneuver things surreptitiously for their own gain, without ever appearing on the stage. It may be pointed out that this character of the Jews was already prominent during the days of Prophet Muhammad (Peace be upon him), and that it is this very inclination towards behind-the-scene subversive activities that has produced – despite their long history of bloody

Dr. Ahmed Afzaal

LESSONS FROM HISTORY-VII

Based on the Urdu Columns by: Dr. Israr Ahmad

Allies of One Another

The early Christians were generally considered as nothing more than a Jewish sect, but with the passage of time the alien concepts implanted by St. Paul – Trinity, Atonement, Abolition of the Mosaic Law – made them a different people altogether. The initial three centuries of the Common Era were characterized by severe persecution being inflicted upon the Christians, a considerable segment of which still consisted of Unitarians, at the hands of both the Jews and the Romans. However, the whole situation changed dramatically when the Roman Empire embraced Christianity, as a result of which the Jews became the target of official harassment and oppression. As the Christians saw it, Jews were guilty of "deicide", the murder of their God, and therefore they excluded the latter from the mainstream of socio-economic life. This trend continued unabated in the Middle Ages, often manifiesting as wholesale killings of the Jews. In 1096, for example, the Crusaders on their way through France and Germany massacred thousands of Jews. Widespread killings took place in 1146 by the armies of the second Crusade. More than a thousand Jews were hanged in England, in 1234, for allegedly circumcising a Christian boy. In 1290, Jews were banished from England by King Edward. In 1350, they were held responsible for the spread of plague, and hundreds of thousands were murdered in Europe. They were forced to live together under subhuman conditions called "Ghettos". Religious courts, or "Inquisition", ordered the burning of thousands of Jews during the 15th century. and there events were witnessed and celebrated as popular holidays.

Ironically enough, druing more than a thousand years of humiliation and persecution, the only respite of peace and prosperity experienced by the Jews was in the Muslim territories.

قرآن کالج لاہور

بی۔اے (سال سوم) میں براہ راست داخلہ

اس سال انٹرمیڈیٹ کے نتائج کا اعلان ہونے سے قبل بی۔اے (سال سوم) میں براہ راست داخلہ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے :

دیگر کالجوں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے والے طلبہ کے لئے، بی۔اے کی باقاعدہ تدریس کے آغاز (اکتوبر 96ء) سے پہلے، یکم جولائی 96ء سے ایک سہ ماہی تربیتی کورس کا انعقاد کیا جا رہا ہے، بی اے میں داخلے کے خواہشمند طلبہ کے لئے اس کورس سے گزرنا لازم ہو گا۔ اس کورس کی کامیابی کے ساتھ تکمیل پر یہ طلبہ قرآن کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے والے طلبہ کے مساوی اہلیت حاصل کر کے ان کے ہمراہ بی۔اے کی تعلیم حاصل کریں گے۔ (واضح رہے کہ قرآن کالج میں عربی بطور اختیاری (Elective) مضمون اختیار کرنا ضروری ہے)۔

مذکورہ بالا سہ ماہی تربیتی کورس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تعلیم دی جائے گی :

1۔ عربی گرائمر 2۔ انگریزی گرائمر 3۔ تجوید

4۔ قرآن مجید کا منتخب نصاب 5۔ مطالعہ دینی لٹریچر

درخواست دینے کی آخری تاریخ	27 جون 1996ء
انٹرویو کی تاریخ	30 جون 1996ء
تربیتی کورس کا آغاز	یکم جولائی 1996ء

المعلن : پرنسپل، قرآن کالج، لاہور

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور فون : 38۔5833637

زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور